انّا کو آنے دو
احمد صغیر

اَنّا کو آنے دو

احمد صغیر

اِس کتاب کی اشاعت میں اُردو ڈائرکٹریٹ راج بھاشا (بہار)
کا مالی تعاون شامل ہے۔

اِس کتاب میں شائع مواد سے اُردو ڈائرکٹریٹ راج بھاشا (بہار) کا
متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی بھی قابل اعتراض مواد کی
اشاعت کے لئے خود مصنف ذمہ دار ہے۔

اَنّا کو آنے دو

(افسانے)

احمد صغیر

زیر اہتمام

مکتبہ استعارہ

۲۴۸، استعارہ لین، غفار منزل ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ـ ۲۵

فون: 6318126

ANNA KO AANE DO *(Short Stories)*

by: *Ahmad Sagheer*

نام کتاب : اَنّا کو آنے دو (افسانے)

مصنف : احمد صغیر

پتہ : ترسیل پبلی کیشنز، F-15/9، ٹاپ فلور، جوگابائی ایکسٹینشن
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

اشاعت : ۲۰۰۱ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۱۰۰ روپے (Rs. 100/-)

زیراہتمام : مکتبہ استعارہ، 248 غفار اپارٹمنٹس، استعارہ لین
غفار منزل ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

کتابت و کمپوزنگ: قمر نظامی/نیشنل کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی۔۲۵

سرورق گلیکسی کمپیوٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔۲ فون :۔3254879

مطبع : پرنٹ سینٹر، نئی دہلی۔۲

ملنے کے پتے

۱۔ اہلو والیہ بک ڈپو، ۴۹/۹۹۸۸، نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

۲۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶

۳۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶

۵۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)

۶۔ ترسیل پبلی کیشنز، منی مسجد، گیوال بیگھہ، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

والد محترم

جناب محمد حنیف (مرحوم)

کے نام

ترتیب

انّا کو آنے دو

سارا گاؤں دہشت گردوں کا نشانہ بن چکا تھا ————— '

آہستہ آہستہ گھروں سے اُٹھتے شعلے اب دھواں بن چکے تھے۔ گلیاں ویران تھیں، لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں چھپے بیٹھے تھے جیسے مُرغیاں دربوں میں دُبکی رہتی ہیں۔ آسمان کا کنارہ تک سیاہ مائل ہو چکا تھا اور ہر طرف خاموشی کی طویل چادر بچھی ہوئی تھی۔ پولس جیپ کی گڑگڑاہٹ، سائرن اور سرچ لائٹ کی روشنی سے چند لمحوں میں سارا گاؤں روشن ہو گیا۔ پولس، گواہی اور ثبوت اکٹھا کرنے میں لگ گئی اور ایک بار پھر اَدھ جلے گھروں سے رونے اور چیخ وپکار کی صدائیں بلند ہونے لگیں ————— '

بولنا سب ہی چاہتے تھے مگر خاموشی کی کیلیں سب کے ہونٹوں میں جیسے پیوست کر دی گئی تھیں۔ کتنے ہی نازک پھول مُرجھا گئے تھے یا شاخ سے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے، کتنوں کا تو آشیانہ ہی اُجڑ گیا تھا نہ پردہ، نہ رسّی ،

نہ ٹھنا ہیں..... کُھلے آسمان کے نیچے کتنے ہی لوگ آچکے تھے ______'

پھُلمتیا کے ذہن میں بہت سارے سوالات گونجتے رہے ۔ وہ کھاٹ پر چُپ لیٹی تھی ۔ پھول سی آدھ جلی بچّی اُس کے بغل میں سوئی تھی جس کے زخم پر چند گھنٹہ قبل مرہم لگایا گیا تھا ______ کبھی کبھی پھُلمتیا کو محسوس ہوتا کہ واقعی جینا بہت مشکل ہے ۔ ایک ہی رات میں کیا سے کیا ہوگیا ؟ ______

لیکن یہ کوئی ایک دن کا واقعہ تو تھا نہیں ______ ؟

______ پھُلمتیا جلے ہوئے مکان کی طرف دیکھتی ہے ۔ اُس پر کوئی تصویر موجود نہیں ۔ تمام تصویریں خاکستر ہوچکی تھیں ۔ فقط اُن کے نقوش باقی تھے ۔ بِنّا ، رمنوا ، دُکھیا ، ہریا اور سُمنیا ، گھر کے کتنے ہی افراد مارے گئے تھے اور یہ صرف ایک گھر کی بات نہیں تھی ۔ کتنے ہی گھروں کے افراد ہلاک ہوئے تھے پھُلمتیا تو گن بھی نہیں پائی تھی ۔ کہتے ہیں پولس نے بہت سی لاشیں ہی غائب کر دیں ۔

اُس نے دیکھا دُم کٹا کُتّا پھر بھونک رہا تھا ، ایک ہفتہ سے لگاتار وہ بھونک رہا تھا ، اب اور کون سا حادثہ باقی ہے ؟ ______ اُس نے سوچا ۔ اب وہ اکیلی تھی ایک دم اکیلی ۔ چاروں طرف اندھیرا تھا ۔ اور اُس پھیلے اندھیرے کا وہ ایک حصّہ بنی ہوئی تھی ۔ دل دھڑک رہا تھا ، دھڑکے جا رہا تھا ۔ ابھی تک خوف سے اُس کا بدن کانپ رہا تھا ، کہیں اندھیرے میں وہ راستہ نہ بھول جائے ______ ؟

اِس گاؤں سے اُٹھتی آگ کی لپٹوں کو آس پاس کے گاؤں والوں نے بھی دیکھا مگر ایک انجانی دہشت تھی کہ پورے علاقہ کے لوگوں کے دلوں کو دھڑکائے

جا رہی تھی اور اس دہشت زدہ ماحول میں لوگوں کی نگاہیں خود بخود اننا کو تلاش کر رہی تھیں ______،

______ مگر اُسے تو اقتدار کے ذخیرہ اندوزوں نے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا تھا!

______ پھلمتیا کو اچھی طرح یاد تھا کہ اننا کے آنے سے گاؤں والوں کی خود اعتمادی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی وہ جہاں تہاں لوگوں کو جمع کر کے کہتا رہتا ______

"ساتھیو!

کب تک چپ چاپ ظلم سہتے رہو گے۔ دیکھو اپنے اپنے ویران گھروں کو، اپنے پریواروں کی چتاؤں سے بھٹکتی ہوئی چنگاریوں کو ___ آنسو انسان کو کمزور اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ یہ ظلم غریبوں پر آج نہیں صدیوں سے ہوتے آ رہے ہیں۔ ہر طرح سے شکار صرف غریب ہی ہوئے ہیں لیکن ہم اس طرح ظلم سہتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ ساتھیو، آؤ میرا ساتھ دو، میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں پھر دیکھو کس طرح تمہاری یہ بظاہر اپاہج زندگی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے اور تم محض ایک رینگتے کیڑے نہ رہ کر ایک مکمل وجود بن جاؤ گے اور یہ وجود ہر طرح سے محسوس کیا جائے گا ______،"

اور اننا گاؤں کا ہردلعزیز ساتھی بنتا چلا گیا ______ نئی نئی باتیں ظہور میں آنے لگیں۔ اننا سارا سارا دن گاؤں گاؤں پھرتا رہتا۔ اُس کا دماغ ہمیشہ نئی نئی باتیں سوچتا رہتا۔ پاؤں کی گردش بدستور جاری رہتی، معمولی

معمولی بات پر وہ طوفان برپا کر دیتا جس کے باعث دوسرے لوگوں میں بھی احتجاج کی قوت بڑھ گئی تھی۔ بے چینی، قلبی بے چینی سلگ اُٹھی تھی، نہ جانے کب کہاں انّا آپہنچے اور..........،

_____ شام ہونے کو آئی تھی، دھوپ نڈھال سی آنگن سے رخصت ہو رہی تھی، جیسے ہی پھُلمتیا نے گھر میں قدم رکھا انّا کو چارپائی پر بیٹھا پایا۔ وہ حیرت زدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انّا اور اُس کے گھر _____؟

"آج ہم رات یہیں گزاریں گے، صبح ایک مہم پر جانا ہے۔ باقی ساتھی پیچھے سے آرہے ہیں _____" انّا نے اُسے اطلاع دی۔

پھُلمتیا بغیر کچھ کہے اندر چلی گئی تھی اور کھانے کا انتظام کرنے لگی تھی۔

آدھی رات تک وہ چھپّر پر نظریں جمائے سوچتی رہی۔ دُور سے آنے والی کسی بھیانک آندھی کا شور اُسے سُنائی دیتا رہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے دھندلے چاند کا دُھندلا آسمان ڈوبتا اُبھرتا رہا۔ کس کس کی جان جائے گی۔ کتنے پرندے زخمی ہوں گے۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں گھٹتی بڑھتی رہیں، وہ کھاٹ پر کروٹ بدلتی رہی۔ بالآخر وہ بے چینیوں کی کشاکش سے تھک کر چور ہوگئی اور رات کے کوئی تیسرے پہر نیند نے اُس کی بے قراری کو قرار دے ہی دیا _____،

صبح نمودار ہوتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی تھی اور جلدی سے انّا کی کھاٹ تک پہنچی لیکن انّا نہ جانے کس وقت چلا گیا تھا۔ وہ باہر آئی اور دُور تک گاؤں سے باہر جانے کے راستہ کو تکتی رہی۔ اکّا دکّا لوگ آجا رہے تھے، بس _____، آج کیا ہونے والا تھا؟ _____ وہ دیر تک اپنے آپ سے پوچھتی رہی اور جواب نہ پاکر مزید اُلجھتی رہی۔ سارا دن وہ گھر، صحن اور دہلیز کے چکّر لگاتی

رہی ۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک گیا ۔ ذرا دیر ٹھہر کر آرام بھی نہ کر پائی ـــ گھر آنگن میں رہتے ہوئے بھی نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتی رہی ــــــــ انا کی مہم کا کیا ہوا ؟ ــــــــ انّا کے بہت دشمن ہیں ۔ سب کی نظروں سے اُسے بچنا پڑتا ہے ــــــــ آسمان کا کنارہ کتنا سُرخ تھا ۔ اُسے محسوس ہوتا کہ لمحہ بھر میں آسمان سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں گی ۔ خون خون ــــــــ سارا منظر خون خون ! ــــــــ

دوپہر سے شام ہونے کو آئی ۔ سرمئی اندھیرے کا وجود قریب آتا چلا گیا ۔ سب آنے والی رات کو آنکھوں میں بسانے کے انتظام میں لگے تھے ۔ پُھلمتیا صحن سے ہوتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی ۔ اُس نے چراغ روشن کر دیا ۔ لمحہ بھر میں کمرہ روشن ہو گیا تھا لیکن پُھلمتیا کی آنکھوں میں نیند کی آہٹ تک نہیں تھی بس رہ رہ کر اُس کے ذہن میں ایک ہی نام اُبھرتا ــــــــ انّا ــــــــ انّا ــــــــ وہ نام جو اب سارے گاؤں کی زبان پر تھا ۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا ؟

پچھلے ہی دنوں کی بات ہے ۔ لکھیا جو بابو صاحب کی حویلی میں برتن مانجھنے کا کام کرتی تھی حمل سے رہ گئی تھی ۔ بہت پوچھے جانے پر اُس نے بابو صاحب کا نام بتا دیا ۔ پھر کیا تھا ۔ انّا کے غصّے کی انتہا نہ رہی ۔ گاؤں کی عزّت کی بات تھی ۔ دو سو آدمیوں کے ساتھ بابو صاحب کی حویلی پر اُس نے دھاوا بول دیا اور حویلی کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا ــــــــ

عجیب آدمی ہے کچھ بھی کر سکتا ہے ۔ سارا گاؤں اُس کا ہے اور وہ سارے گاؤں کا ۔ وہ جو عہد کرتا ہے پورا کرتا ہے ۔ کبھی وہ ایک جگہ نہیں ٹکتا ۔ آج اس گاؤں میں تو کل دوسرے گاؤں میں ۔ رات یہاں تو دن کہیں اور ۔ اُس کے پیر میں گویا چرخی لگی ہوتی ہے ۔ ہنسی کبھی اُس کے چہرے پر نمودار نہیں ہوئی ، ہمیشہ تمتمایا ہوا چہرہ ۔

اور ساری دُنیا کے نظام کو بدل دینے کا عزم ——— بھاشن دیتا تو چہرہ کیسا سُرخ ہو جاتا۔ وہ کیا کیا کہتا تھا۔ سب بات تو پُھلمتیا کی سمجھ میں نہ آتی مگر کچھ جُملے کہیں کہیں سے اُس کو یاد تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے کہا تھا ———

"یہ ساری ویوستھا سڑی گلی ہے، جس محکمے میں جائیے وہاں رشوت اور بھرشٹاچار پنپ رہا ہے۔ ہر کوئی ہاتھ میں بھیک کا پیالہ لئے بیٹھا ہے اور ہم لوگ بھی اُس کے پیالے میں کچھ نہ کچھ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ عادت بدلنی پڑے گی۔"

تقریر ختم ہو گئی۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے انا کو گود میں اُٹھا لیا ——— کامریڈ "انا کو لال سلام ...... لال سلام لال سلام!" ——— بڑا جوشیلا اور بدن میں خون کی رفتار کو تیز کر دینے والا منظر تھا۔ پُھلمتیا مجمع سے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی ——— آج کسی آفیسر کی ضرور شامت آنے والی ہے .....

یہ آئے دن کا معمول تھا۔ جب کسی کے خلاف احتجاج کرنا ہوتا، وہ لوگوں کو جمع کرتا، جوشیلے بھاشن دیتا اور احتجاجی طریقے پر عمل کر بیٹھتا۔

کارو مستری کے پریوار کو بے دردی سے مار دیا گیا تھا۔ اُس کا قصور بس یہی تھا کہ اُس نے مکھیا کے خلاف کورٹ میں گواہی دی تھی۔ سچ بولنے کی اتنی بڑی سزا؟ ——— ایک سچ کے عوض پانچ پانچ لوگوں کی جانیں! ——— اور دوسری صبح انا مہم پر نکلا تھا اور مکھیا کے ظالم ہاتھوں کا وجود ختم ہو گیا تھا ———'

یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ ——— کیا اکیلا انا ساری دُنیا سے لڑ پائے گا؟

دفعتاً اُس کا ذہن انا پر آکر ٹھہر گیا ———'

اب کیا ہوگا؟

انا کو ہر حادثہ کی خبر ہو جاتی ہے اور کسی نے اُس تک آج کے حادثہ کی

خبر ضرور پہنچا دی ہوگی ۔ انّا پر کیا گزر رہی ہوگی یہ وہ اچھی طرح سمجھ رہی ہے ۔ اگر وہ جیل میں نہ ہوتا تو کب کا یہاں پہنچ چکا ہوتا اور جن عدالت لگا کر کوئی نہ کوئی فیصلہ لے چکا ہوتا اور پھر کسی بڑے کانڈ کی خبر قومی اخباروں کی موٹی موٹی سرخیاں بن جاتیں ______ '

یہ بہاؤ کہاں جاکر تھمے گا ؟

کیا اکیلا کسی انّا اِس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود اب لازمی ہے ؟ ہر گاؤں ہر قصبے اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے لیکن اس قدر انّا آئے گا کہاں سے ؟ ______ برسوں میں صرف ایک انّا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اُسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے ______ '

تو کیا ہر ماں کو ایک انّا .... ؟

پھُلمتیا یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دھیرے دھیرے واپس جاتی جیپ پر بیٹھے دو شخص جلے مکانات کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے ______

" بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے ، ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے ! "

پھُلمتیا اچانک سُلگ اُٹھی ۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور چلّا کر بولی ______

" انّا کو آنے دو سالو ! پتہ چل جائے گا ! " ______ پھُلمتیا کی آواز اُن ٹھنڈا کرنے والوں تک پہنچی یا نہیں لیکن وقت کے گنبد میں اُس کی آواز دیر تک گونجتی رہی ______ '

انّا کو آنے دو ______ !

انّا کو آنے دو ______ !!

●●

پیاسی ہے زمیں، پیاسا آسماں

دروازہ کھولتے ہی نشی اپنی نوکرانی منکی پر برس پڑی ______

" یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ بچوں کو اسکول جانا ہے۔ صاحب کو دفتر اور مجھے کالج۔ میں اِدھر دیکھ رہی ہوں تمہارے اوپر چربی کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ دیکھو اگر کام کرنا ہے تو صبح چھ بجے آجاؤ، نہیں تو کام چھوڑ دو۔ بہت کام کرنے والی مِل جائے گی۔"

" مالکن کا بتاؤں۔ میرا آدمی روج دارو پی کر آتا ہے اور رات بھر گالی گلوج مار پیٹ کرتا رہتا ہے۔ اِسی واسطے جرا بھور میں آنکھ لگ جانے کے کارن دیر ہو جاتی ہے ______" منکی اپنی صفائی پیش کرتی ہے۔

" دیکھو وہ ہم نہیں جانتے کہ تمہارے گھر میں کیا ہوتا ہے، ہم کو تو اپنا کام چاہئے۔ تمہیں ہر مہینے دو سو روپیہ دیتے ہیں، کھانا دیتے ہیں، پھر کام بھی مجھے پورا چاہئے ______" نشی کی آج تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

" ٹھیک ہے مالکن اب وکت پر آئیں گے " ——— منکی خاموش رہنا ہی بہتر سمجھی ۔

" اچھا جاؤ اور جلدی جلدی سارا کام نپٹاؤ ۔ "

" جی مالکن ! "

ابھی نشی پلٹ کر دوسرے کمرے کا رُخ کرنے ہی والی تھی کہ اُس کے شوہر راجیش نے بغل والے کمرے سے آواز دی ———

" نشی ! "

" جی ابھی آئی " ——— نشی راجیش کے کمرہ میں پہنچ گئی ۔

" ذرا دیکھو تو میری ٹائی کہاں ہے " ——— راجیش رومال سے چشمے کو صاف کرتا ہوا بولا ۔

" وہ تو سوٹ کے ساتھ ہی تھی " ——— نشی وارڈ روب کھولتی ہے اور تلاش کرنے لگتی ہے ۔

" یہ رہی اِدھر گری ہوئی تھی ۔ "

راجیش شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر ٹائی باندھتا ہے ———

" آج دفتر میں ایک میٹنگ ہے اس لئے دیر سے لوٹوں گا ۔ "

" اور بچے ؟ "

" بچوں کو تم گاڑی سے لے لینا " ——— راجیش بریف کیس اُٹھاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے ۔

راجیش ایک کمپنی میں مینیجر ہے اور نشی ایک کالج میں لکچرر۔ اُن کے دو بچے بھی ہیں ۔

مُنکی کے وقت کا سورج بوڑھا ہو چلا تھا ۔ وہ وقت کے سورج کی تیز

دھوپ میں برسوں سے تپ رہی تھی۔ اُس کی زندگی میں کوئی درخت سایہ دار نہ تھا۔ اُس کا شوہر کارو ایک تاڑ کے درخت کی مانند تھا جو کسی کو سایہ نہیں دیتا۔ وہ دن بھر اِدھر اُدھر چھوٹے موٹے کام کرتا اور شام کو لوٹتا تو دارو کی دُکان پر ضرور جاتا۔ دارو پیتا اور گھر لوٹ کر مُنکی کو مارتا پیٹتا۔ کبھی مُنکی کا لایا ہوا کھانا کھا کر یا کبھی بغیر کھائے ہی سو جاتا۔ مُنکی اوّل تو دن بھر نشی کے یہاں کام کرتی، پھر رات کو شوہر کی اذیّت سہتی! ـــــــــ اُس کے دو بچّے تھے ایک سات سال کی بیٹی پارو اور ایک بیٹا جو ایک سال کا ہو گیا تھا ـــــــــ مُنکی صبح اُٹھتے ہی نشی کے گھر کام کے لئے چلی جاتی تب اُس کی بیٹی پارو ہی اُس بچّے کی دن بھر دیکھ بھال کرتی۔ آدھا کیلو دودھ گوالہ دے جاتا جس میں کچھ پانی ملا کر دن بھر پلاتی رہتی۔ مُنکی رات کا بچا ہوا باسی کھانا جو چھوڑ جاتی اُسے کھا کر گذارہ کرتی۔ پھر رات کو ماں کھانا لے کر لوٹتی تو کھاتی اور سو جاتی۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ مُنکی اپنے کام میں مشغول تھی۔ نشی صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ آج اُس کا کلاس نہیں تھا۔ راجیش دفتر گیا ہوا تھا اور بچّے اسکول۔ اُسی پل پارو بلکتی ہوئی بچّے کو لے کر گھر میں داخل ہوئی اور سیدھے ماں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ پہلے بھی کئی دفعہ ماں کے ہمراہ اِس گھر میں آ چکی تھی۔ مُنکی اپنے بچّے کی آواز پہچان گئی اور کچن سے باہر آئی ـــــــــ

"کیا ہوا پارو؟"

"ماں آج دودھ والا نہیں آیا۔ ببلو صبح سے رو رہا ہے۔"

"اوہ! اُس گوالے پر آ چھت ٹوٹے۔ بچّے کا بھی کھیال نہیں کرتا۔ اب کیا کریں۔"

مُنکی بچّے کو گود میں لے کر چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اپنا دودھ پلانے کی کوشش

کرتی ہے مگر اُس کی چھاتی میں بھی دودھ نہیں اُتر رہا تھا۔ وہ کھاتی ہی کیا تھی۔ بس دوپہر کا کھانا۔ رات کے کھانے میں تو اُس کی بیٹی اور اُس کا شوہر بھی شریک ہو جاتا۔ بس دو ایک نوالہ کھا کر ہی رہ جاتی ——— اُس کا بچّہ کسی صورت نہیں بہلتا ہے۔ وہ روتا ہی جاتا ہے۔ مُنکی پریشان ہو جاتی ہے کہ کیا کرے۔ اُس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے کہ دودھ خرید کر بچّے کو پلا سکے، وہ تڑپ اُٹھتی ہے۔ بالآخر وہ نشی کے پاس جاتی ہے ———

" مالکن میرا بچّہ بھوک سے بلک رہا ہے۔ آج دودھ والا نہیں آیا ہے۔ تھوڑا سا دودھ دے دیجئے۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔ "

نشی مُنکی کو بہ غور دیکھتی ہے۔

" مُنکی تم تو جانتی ہو کہ میرے یہاں فاضل دودھ نہیں آتا۔ اتنا ہی آتا ہے جتنا خرچ ہوتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کہاں سے دوں۔ "

" مالکن آپ دیکھئے نا تھوڑا بہت اِس بچّے کے لئے نکل ہی آئے گا۔ "

" کہہ دیا نا، نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو " ——— نشی نے ناگواری سے کہا۔ مُنکی نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی مگر بچّہ کے لئے کچھ کرنا بھی تھا، وہ نشی سے بولی ———

" مالکن ہم ابھی گھر جاتے ہیں۔ ببوا کے لئے دودھ کا انتجام کریں گے۔ واپس آکر باکی کام نپٹا لیں گے " ——— اور وہ نشی کا جواب سُنے بغیر ہی باہر نکل گئی۔

صبح صادق کی پہلی کرن جب مندروں کے کلس پر پڑی تو جیسے دھوپ نے گنیش جی کی مورتی کو پیاس کا احساس شدت سے دلایا۔ اُن کے ہونٹ سوکھے دکھائی دیئے تو بھگتوں سے دیکھا نہ گیا۔ وہ سب دودھ کا گلاس لے لے کر ایسے

دوڑے جیسے واقعی گنیش جی صدیوں سے پیاسے ہیں اور آج وہ اپنی ساری پیاس بجھا کر ہی دم لیں گے۔ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ گنیش جی کے ہر مندر میں بھگتوں کی لائنیں لگ گئیں۔

جب یہ خبر نشی تک پہنچی تو وہ بھی دودھ کا گلاس لے کر مندر دوڑی۔ راجیش ابھی تک سویا ہوا تھا۔ نشی دودھ پلا کر لوٹی تو راجیش کو جھنجھوڑ کر جگایا۔

"تم ابھی تک سو رہے ہو۔ یہاں چمتکار ہو گیا۔ گنیش جی دھرتی پر اُتر آئے ہیں اور دودھ پی رہے ہیں۔"

راجیش جاگ گیا ——————،

"کیا بکتی ہو؟"

"ارے اُٹھو تو گنیش جی دودھ پی رہے ہیں، جاؤ تم بھی جا کر پلا آؤ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہارا وہم ہے یا کسی کی سیاست ہوگی۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو خود پلا کر دیکھ لیجیے" —————— نشی راجیش کو یقین دلانا چاہتی ہے۔

"چلو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے" —————— راجیش بھی دودھ کا گلاس لے کر چل پڑا۔

ابھی راجیش گھر سے نکلا ہی تھا کہ مُنکی آ گئی۔

"مُنکی تم نے سُنا گنیش جی دودھ پی رہے ہیں؟"

"ہاں مالکن سُنا تو ہے، میرے محلّے میں بھی کئی عورتوں نے جا کر گنیش جی کو دودھ پلایا ہے۔"

"تم نے پلایا کہ نہیں؟"

"مالکن ہم گریب لوگ کہاں سے پلائیں گے؟ بچّہ کو تو پینے کھاتر دُودھ ملتا

نہیں ۔ اب گنیش جی بھی دودھ پینے لگے تو دودھ کا اکال پڑ جائے گا ۔ "

" ارے تو اُس کی فکر چھوڑ اور جلدی سے گنیش جی کو دودھ پلا کر آ ۔"

" مالکن میرے پاس دودھ نہیں ہے ۔ آج بھی گوالہ ابھی تک دودھ نہیں دے گیا ہے ! "

" میں دیتی ہوں " ________ نشی کیچن میں جاتی ہے اور گلاس میں بھر کر دودھ لاکر دیتی ہے۔

" جا جلدی جا ! کہیں گنیش جی کا پیٹ بھر نہ جائے اور دودھ پینا بند نہ کر دیں " ________ نشی مُنکی کو گلاس تھماتے ہوئے بولی ۔

مُنکی بھی گلاس لے کر تیزی سے باہر نکل پڑی ۔ اُس کے تیز قدم مندر کی طرف اُٹھ رہے تھے مگر دھیان اپنے بچّے کی طرف تھا ۔ اگر آج بھی دُودھ والا نہیں آیا تو پھر میرا بچّہ ________ ؟

اُس کے قدم رُکنے لگے ________ ،

گنیش جی کو پلانے کے لئے مالکن کے بھی کیچن میں دُودھ نکل آتا ہے ، مگر میرے بچّے کے لئے ؟

مُنکی رک گئی ، اُس نے ایک نظر مندر کی طرف جاتی ہوئی بھیڑ کو دیکھا ، کچھ سوچا ، اور پھر دھیرے سے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی ____ !

●●

اُور ٹائم

پھر کہیں سے سنسناتا ہوا اندھیرا اُس کے وجود کے اوپر سے گذرنے لگا، اُس اندھیرے کی ہیبت ناک موجیں اُس کو روندتی چلی جا رہی تھیں کہ دفعتاً اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ سو گئی تھی یا شاید کوئی جھپکی آ گئی تھی یا پھر نیند اور بیداری کے درمیان وہ کہیں کھو گئی تھی، کچھ دیر کے لیے! ـــــ کھڑکی سے مدھم چاندنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اُس نے لیٹے لیٹے چاند کی جانب سر گھما کر دیکھا۔ ایک بے جان سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر بکھر گئی ـــــ ایک اُس کا بھی تو چاند ہے جسے بادلوں نے ڈھک لیا ہے ـــــ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرے اندھیرے میں ٹوٹتی بکھرتی سی سفید لکیریں اُس کی آنکھوں میں کوئی شبیہ بناتی گزر جاتی ہیں ـــــ یہ کس کی شبیہ ہے؟ ـــ

"بھیکو!" ـــــ اُس کے تصوّر میں یہ نام کئی بار چمکتا ہے اور اُمید کی لَو سر اُٹھاتی ہے کہ بھیکو اچانک اپنے بستر سے اُٹھے گا اور اپنی

مضبوط باہنوں میں اُسے جکڑ لے گا ــــــ اُس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور بھیکو کے بستر کی طرف دیکھا ــــــ لیکن بھیکو گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ اُس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کی آنکھوں کے کنارے پوری طرح بھیگ چکے تھے ــــــ،

رنجیت سنگھ کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے گُلبیاؔ ذرا جھجکی تھی ــــ اُس نے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ لیا تھا۔ دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ بس اطمینان کی بات یہی تھی کہ بھیکو اس کا پتی اُس کے ہمراہ تھا جو اپنے مالک سے ملوانے اُسے لے جا رہا تھا۔ گلبیاؔ آس پاس قرینے سے سجی تمام چیزوں کو دیکھتی بھی جاتی تھی اور من ہی من خوش بھی ہو رہی تھی کہ اُس کا پتی اتنے بڑے گھر میں کام کرتا ہے ــــــ،

کمرے میں رنجیت سنگھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے قریب کھڑی گلبیاؔ کو دیکھا اور مسکرائے ــــــ،

"مالک یہ گلبیاؔ ہے، گلبیا! ــــــ" مالک کے پیر چھوکر آشیرواد لے۔"
گلبیاؔ پیر پر جھک گئی۔ رنجیت سنگھ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
"سدا سوبھاگیہ وتی رہو" ــــــ پھر سو سو کے دو نوٹ نکال کر انھوں نے اُس کی طرف بڑھائے ــــــ "یہ رکھ لو"

ــــــ گلبیا نے اپنی کوٹھری کو دیکھا۔ یہی اُس کی جنّت تھی۔
"گلبیاؔ تم کو مالک کیسے لگے۔؟" ــــــ بھیکو ایک طرف بیٹھتا ہوا بولا۔
"میں تو ڈر کے مارے اُن کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہ پائی!" ــــــ گلبیا

زور سے ہنسی ______'

" مالک اور مالکن دونوں بڑے دیالو ہیں، ای جو ساڑی تو پہنے ہے انھوں نے ہی دیا ہے۔ پھر سادی میں کھرچ کے واسطے روپیہ بھی دیا تھا ______"

دھیرے دھیرے گلبیا بھی اس حویلی کا ایک حصہ بن گئی۔ اُس کا زیادہ وقت کوشلیا کے پاس گذرتا۔ جب کہ بھیکو دن بھر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتا۔ رات دونوں کی اپنی ہوتی۔ گلبیا کو بھیکو کا اتنا کام کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ اُس نے بھیکو کا کام ہلکا کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کے کمرہ کی صفائی بھی اپنے ذمّہ لے لی تھی۔ تب ہی اُس نے یہ محسوس کیا کہ رنجیت سنگھ کی نگاہیں اُس کے چاروں طرف چکّر لگاتی رہتی ہیں۔ پہلے تو اُس نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا مگر پھر اُس کی چھٹی حِس بیدار ہوگئی اور ایک انجانے خوف سے گلبیا کا دل رہ رہ کر دھڑکنے لگا ______'

ایک دن مالکن بھیکو کو لے کر دوسرے گاؤں گئی تو رات میں بھی نہ لوٹی۔ اُس رات گلبیا رنجیت سنگھ کا بستر ٹھیک کرکے لوٹ رہی تھی تو رنجیت سنگھ نے اُسے روکا ______

" گلبیا ! آج تو یہیں سوئے گی ! "

" مالک اِی کا کہہ رہے ہیں ؟ ای پاپ ہے۔ "

" پاپ اور پُنیہ کے چکّر میں تم کیوں پڑتی ہو۔ یہ ہم پر چھوڑ دو۔ "

" مالک ہم پر ترس کھائیے۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ "

" تو ڈرتی کیوں ہے ہم جو تیرے ساتھ ہیں۔ "

" نہیں، ہم بھیکو کے سوا دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے مالک۔

" میرے ساتھ ایک رات سو جانے سے تو بھیکو سے تھوڑے ہی الگ ہو جائے گی۔

کہلائے گی تو بھیکو کی ہی پتنی ۔"

رنجیت سنگھ اُس کی طرف بڑھتا ہے لیکن گلبیاؔ نکل بھاگتی ہے اور اپنی کوٹھری میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیتی ہے ۔ وہ رات بھر روتی رہتی ہے اور ہر آہٹ پر چونک اُٹھتی ہے ـــــ'

دوسرے دن بھیکو آجاتا ہے تو گلبیاؔ لٹک جاتی ہے کہ گاؤں لوٹ چلا جائے ۔

" اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی ۔ مجھے یہاں سے لے چلو"ـــــ

" کیا بات ہے ؟ ایسی کیا بات ہو گئی کہ تم نے جانے کا سوچ لیا ؟"ـــــ بھیکو متعجب ہو کر پوچھتا ہے ۔

" تم باہر چلے جاتے ہو تو اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے ۔"

" اِس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ۔ یہاں مالک مالکن ہیں اور گھر میں اور بھی تو نوکر چاکر ہیں ۔"

" تمہاری بات اور ہے ، اور ویسے بھی میرا دل اب یہاں نہیں لگتا ـــــ ہم لوگ اپنے گاؤں میں محنت مجوری کر کے پیٹ بھر لیں گے مگر یہاں نہیں رہیں گے ۔"

" گلبیا اگر کوئی اور بات ہے تو بتاؤ ہم سوچیں گے مگر یہ اچانک جانے کی بات ؟"

" میں نے کہہ دیا کہ نہیں رہوں گی ۔ تم چلتے ہو یا نہیں ؟"ـــــ

بھیکو گلبیا کا تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا ۔

" ٹھیک ہے چلوں گا ۔ مالک اور مالکن سے بول کر آتا ہوں ۔ پیسے بھی تو لینے پڑیں گے ۔ کرایہ تو لگے گا نا !"ـــــ

بھیکو نہیں جانا چاہتا تھا ۔ کتنا آرام تھا اُسے یہاں پر ۔ صرف

کام ہی تو کرنا پڑتا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لئے کام تو کہیں بھی کرنا ہی پڑے گا،
بھیکو رنجیت سنگھ کے پاس پہنچتا ہے۔
" مالک گلبیا گھر جانا چاہتی ہے کچھ روپیہ دے دیجئے ــــــــــ " وہ
نظر نیچی کئے بولتا ہے۔
" اتنی جلدی ــــــــ ؟ ابھی اُسے آئے کئے دن ہوئے ہیں ؟ "
" مالک جلد کر رہی ہے تو ہم کا کریں۔ "
" تم اُسے سمجھاؤ۔ یہاں اُسے کوئی تکلیف ہے یا کسی سے کوئی شکایت ہے؟"
" مالک ہم نے تو بہت سمجھایا مگر او ہمری بات مانتی ہی نہیں۔ "
رنجیت سنگھ خاموش ہو جاتے ہیں اور کچھ سوچنے لگتے ہیں۔
" ٹھیک ہے پہنچا دو مگر تم تو پہنچا کر آؤ گے نا؟ "
" مالک........ بات اِی ہے کہ .... ہم .... گلبیا کے بنا نہیں
رہ سکتے ...... سو ...... اب ہم لوگ اپنے گاؤں میں ہی مجوری کرنے کا فیصلہ
کیا ہے " ــــــــــ بھیکو ڈرتے ڈرتے بولا۔
" بھیکو جب تم لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں روکنے والا کون ہوتا
ہوں۔ جاؤ میرا آشیرواد ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہے گا۔ "
" مالک ...... کچھ روپیہ سے مدد کر دیتے " ــــــــــ بھیکو نظر نیچی
کئے ہی بولتا ہے۔ رنجیت سنگھ بھیکو کو غور سے دیکھتے ہیں۔ بھیکو پشیمان دکھائی
دیتا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتے ہیں ــــــــــ
" دیکھو بھیکو ابھی تو میرے پاس روپیہ ہے نہیں، کل اتوار ہے، پرسوں سوموار
کو بینک کھُلے گا تو روپیہ نکالوں گا، تم لے لینا۔ "
" ٹھیک ہے مالک دو دن رُک جاتے ہیں۔ " ــــــــــ بھیکو اپنے

گچھے سے آنسو پوچھتا ہوا چلا جاتا ہے۔

بھیکو کے جانے کے بعد رنجیت سنگھ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور وہ معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کوشلیا ٹی وی کے سامنے بیٹھی پروگرام دیکھنے میں محو تھی، بُدھنا باہر گائے بھینس کو چارہ ڈال رہا تھا اور گلبیا اپنی کوٹھری میں بیٹھی آنے والے کل کے تصورات میں کھوئی تھی کہ کس طرح وہ اپنی جھونپڑی کو سجائے گی اور بھیکو کے بیٹے کو پڑھائے گی لکھائے گی تاکہ اس کی پتنی پر اُس کا مالک بُری نگاہ نہ ڈالے۔ وہ پڑھ لکھ کر ضرور کسی دفتر کا بابو بنے گا۔ بھیکو کی طرح وہ نوکر نہیں ہوگا۔ اگر بھیکو کی کمائی کم پڑی تو وہ بھی مزدوری کرے گی تاکہ اُس کے بچے کسی حویلی کے بیگار نہیں بنیں ——'

اس کی سوچ کی لہریں پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتی رہتیں کہ بُدھنا نے ہانپتے ہوئے آکر بتایا کہ بھیکو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے ——

بھیکو کو رنجیت سنگھ نے صبح ہی صبح کسی کام سے دوسرے گاؤں بھیجا تھا۔ گلبیا بدحواس دوڑتی ہوئی حویلی کی طرف بھاگی۔ رنجیت سنگھ کوشلیا کو ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتا رہے تھے۔ گلبیا اُن کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور روہانسی آواز میں اُن سے پوچھا ——

"مالک کیا ہوا ہمرے بھیکو کو؟"

"اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ جاؤ، جاکر دیکھ آؤ۔"

گلبیا ہسپتال پہنچ جاتی ہے۔

بھیکو بُری طرح حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ کمر سے نیچے کا پورا حصّہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بھیکو ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا ــــــــــ'

دو ماہ تک گلبیا کو حویلی اور اسپتال ایک کرنا پڑا۔ صبح دوا دارو کے بعد گلبیا حویلی چلی جاتی۔ دن ڈھلے پھر اسپتال کا ایک چکّر لگاتی اور پھر ساری رات وہ زمین پر بھیکو کے پیتانے گذار دیتی۔ اس درمیان ایک دفعہ رنجیت سنگھ بھی ہسپتال آئے۔ ڈاکٹروں سے باتیں کرنے کے بعد وہ بھیکو کے پاس بھی آئے اور گلبیا کو ڈھارس دینے کی کوشش کی ــــــــــ

" دیکھو گلبیا جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ بھیکو پوری طرح ٹھیک ہو کر آ جائے۔ میں نے ڈاکٹر کو کہہ دیا ہے کہ کسی بھی حالت میں بھیکو کو ٹھیک ہو جانا چاہیئے ــ "

" مالک ہمرا بھیکو ٹھیک ہو جائے گا نا ؟ "

" ضرور ٹھیک ہو جائے گا ، گھبراؤ نہیں ۔ "

" مالک ہم بھیکو کے بنا نہیں رہ سکتے۔ ــــــــــ " وہ رونے لگی ۔

گاؤں واپس جانے کا خیال گلبیا کی کوٹھری میں ہی سِسک کر دم توڑ چکا تھا۔ اب تو اُسے بس یہی فِکر تھی کہ کسی طرح بھیکو بالکل ٹھیک ہو جائے اور اس کا سہاگ برقرار رہے۔ کوشلیا کا رویّہ کیا ہے ، رنجیت سنگھ اُسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان سب پر دھیان دینے کا اُسے ہوش کہاں تھا۔ حویلی سے لے کر ہسپتال تک کی دوڑ کے علاوہ اُسے اب کچھ یاد نہیں آتا تھا ــــــــــ'

ایک دن ہسپتال جانے سے پہلے وہ رنجیت سنگھ کے پاس گئی ــــــــــ

" مالک! ڈاکٹر بابو دوا دینے میں بڑی دیری کرے ہیں۔ میری نا ہی سُنے ہیں۔ آپ بول دیتے تو ٹھیک ہوتا" ——— وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

رنجیت سنگھ گلبیا کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھے اور گلبیا کے قریب آکر سرگوشی میں بولے ———

" بھیکو ٹھیک ہو جائے گا میں ڈاکٹر کو بول دوں گا۔ بس تم کبھی کبھی اِدھر آجایا کرو۔" ——— انہوں نے اس کے کاندھے پر ایک ہاتھ رکھ دیا۔

" ما...... ما...... مالک..... !" گلبیا سٹپٹا گئی۔ وہ رنجیت سنگھ کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ جانا چاہتی تھی کہ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اسپتال کا وہ کمرہ آگیا جس کے ایک بیڈ پر بھیکو لیٹا گلبیا کی راہ تکا کرتا تھا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ رنجیت سنگھ کا ہاتھ جھٹکنے کی بجائے اُس نے بڑی بے بسی سے اُنھیں دیکھا جو اُس پر جھکے چلے آرہے تھے ———!

بھیکو ہسپتال سے واپس ضرور آجاتا ہے مگر وہ بیساکھیوں کے بغیر نہیں چلتا۔ گلبیا اس کی خوب سیوا کرتی ہے اور ڈھارس بندھاتی ہے کہ ایک دن وہ اپنے سے چلنے لگے گا ———"

رنجیت سنگھ کے یہاں گلبیا کی حاضری بنتی رہتی ہے۔ اکثر آدھی رات کو بھی بھیکو کے قریب سے اُٹھ کر اُسے رنجیت سنگھ کے پاس جانا پڑتا ہے۔ پہلے تو بھیکو نہ سمجھ سکا لیکن آہستہ آہستہ اُسے بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اُس کی دو روٹی اور اُس کا علاج گلبیا کے اور ٹائم کی بدولت ہے۔

گلبیا اندر ہی اندر گھٹے رہی تھی۔ وہ ایک ایسے پرندہ کی مانند خود کو محسوس کرتی ہے جو صدیوں سے کسی پنجرہ میں مقید ہو اور جس کی رہائی کی کوئی اُمید نہ ہو، وہ اکثر سوچتی ——— اب جو اس کا بیٹا ہو گا وہ بھی بھیکو کی طرح

رنجیت سنگھ کی ہی غلامی کرے گا۔ وہ کبھی پڑھ لکھ نہیں سکے گا، کبھی دفتر کا بابو نہیں بن سکے گا۔ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوگی بلکہ رنجیت سنگھ یا رنجیت سنگھ کے بیٹے کی بھیک میں دی ہوئی زندگی ہوگی۔ اس کی پتنی اگر اور ٹائم نہیں کرے گی تو اُسے بھی بھیکو کی طرح ایک دن اپاہج بنا دیا جائے گا۔ اور تب اُس کی پتنی رنجیت سنگھ کی حویلی میں اور ٹائم کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ابھی ابھی گلبیا حویلی سے نکل کر آئی تھی۔ بھیکو کے نزدیک بستر بچھا کر وہ لیٹ جاتی ہے۔ کھُلی کھڑکی سے سفر تمام کرتے چاند کی شعاعیں کوٹھری کا اندھیرا دور کر رہی تھیں۔ مگر گلبیا کے من کا اندھیرا دور کرنے کے لئے چاند کہاں سے آئے گا؟ اُس کا چاند بے جان کچھوے کی طرح بستر سے لپٹا پڑا تھا ــــــــ،

ــــــــ پھر کہیں سے سنسناتا ہوا اندھیرا اس کے وجود کے اوپر سے گذرنے لگا۔ اُس اندھیرے کی ہیبت ناک موجیں اس کو روندتی چلی جا رہی تھیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُن ہیبت ناک موجوں کی لپیٹ میں بھیکو بھی ہے اور اُس کے خواب بھی ہیں اور اب ...... وہ موجیں اُس راستہ پر آگے بڑھ رہی ہیں جو اُس کے گاؤں کو جاتا ہے ــــــــ!

جنگ جاری ہے

گھنگھور گھٹائیں ابھی تک چاروں طرف چھائی ہوئی تھیں۔ مینہ اُسی طرح برسے جارہا تھا۔ اُس نے جب آنکھ کھولی تو چاروں طرف تاریکی اور سنّاٹے کا راج تھا اور اندھیرا مزید بڑھتا جارہا تھا۔ وہ شخص جو ابھی ابھی بے ہوشی کی قید سے آزاد ہوا تھا۔ پہلے اپنے اردگرد کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ ایک کھیت میں کیچڑ میں لت پت پڑا تھا۔ دھیرے دھیرے اُس کو سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ اُف! ـــــــ اُس نے سوچ کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ جسم کے کسی حصّے میں درد کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ پیر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کافی دیر اُسی طرح بیٹھا کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہے تو کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اپنے اردگرد پھیلی تاریکیوں کو۔ وہ کہاں جائے؟ ـــــــ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ خود کو بالکل بے بس محسوس کرتا ہے، بجلی رہ رہ کر چمکتی ہے۔ وہ اُٹھنا چاہتا ہے لیکن لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ گولی اُس کی ٹانگ میں

لگی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر زخم کو چھوتا ہے۔ خون جم گیا تھا۔ پتہ نہیں کتنا خون نکلا تھا۔ وہ حوصلہ کو آواز دیتا ہے اور کسی طرح اندھیرے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بجلی چمکتی ہے تو دور اُسے ایک گھر نظر آتا ہے۔ جس سے ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

کھٹ .... کھٹ .... کھٹ .... اُس نے ہمّت جمع کرکے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھُلتا ہے۔ ایک لڑکی ایک پٹ کی اوٹ سے جھانکتی ہے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں اُس شخص کو دیکھتی ہے. جو کیچڑ میں بُری طرح لت پت ہے۔ وہ اُس کے لباس کو دیکھ کر چونک پڑتی ہے،

"کون ہو تم؟ فوجی یا ....؟"

"میں ایک آدمی ہوں اور اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"—— زخمی نے گڑگڑا کر کہا۔

لڑکی کچھ دیر شش و پنج میں کھڑی رہتی ہے اور پھر اندر چلی جاتی ہے۔ ذرا دیر میں ہی وہ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ واپس آتی ہے۔ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ کچھ پوچھ گچھ کرنے کے بعد اُس زخمی کو اندر آنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ زخمی اندر آکر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے۔ پاس کی چارپائی پر ماں بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی گرم پانی اور ایک چھوٹی سی صندوقچی لے کر آتی ہے اور پھر دونوں مل کر کسی طرح ٹانگ سے گولی نکالنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ لڑکی پھر اپنی کوٹھری سے ایک جوڑا کپڑا بھی لاکر دیتی ہے۔

"یہ میرے بھائی کے کپڑے ہیں جو اپنے دستے کا سپہ سالار تھا لیکن اپنے خطہ پر قربان ہو گیا۔"

"بیٹی یہ بھوکا بھی ہو گا۔ دیکھو کھانے کے لئے کچھ ہو تو لاکر دے دو"——

ماں کی روایتی ہمدردی اُبھر کر سامنے آئی۔

وہ لڑکی پھر کوٹھری میں چلی جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی جس میں چند روٹیاں اور تھوڑا سا سالن تھا۔ وہ زخمی کے آگے رکھ دیتی ہے اور پھر پانی لانے چلی جاتی ہے۔

کھانے کے دوران لڑکی زخمی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہے ——

" اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے نہیں آپ ؟ " ——

" میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے کئی ساتھیوں کے ساتھ ایک محاذ پہ بھیجا گیا تھا لیکن دشمنوں کو اس کا پتہ چل گیا اور راستے ہی میں انہوں نے ہم لوگوں پر حملہ کر دیا۔ میرے کئی ساتھی مارے گئے اور میں زخمی حالت میں ایک کھیت میں گھس گیا۔ اور کافی دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو آپ کا گھر نظر آیا اور پھر اب آپ کے سامنے ہوں۔ " ——

سپاہی کھانے سے فارغ ہو کر پاس ہی بستر پر بیٹھ جاتا ہے وہ درد سے کراہتا بھی جا رہا تھا۔

" زخم ابھی تازہ ہے، اس لئے درد ہو رہا ہوگا۔ بھرنے میں تو وقت لگے گا۔ "

" آپ کون ہیں ؟ " —— سپاہی لڑکی سے دریافت کرتا ہے۔

" میں مریم ہوں اور یہ میری ماں ہیں۔ ایک بھائی بھی تھا جو اس علاقہ میں ظالموں کے خلاف نبرد آزما تھا لیکن ...... اُسے شہید کر دیا گیا۔ "

" کیا آپ کا بھائی مجتہد تھا ؟ "

" اور آپ ؟ "

" میں ایک سپاہی ہوں اور اس خطّے کو ظالموں سے آزاد کرانا چاہتا ہوں " ——

" کون ظالم ہے، کون مظلوم ۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا ۔ "

" آزادی قربانی مانگتی ہے ۔ "

" اب تک جس قدر ہمارا خون بہا ہے کیا وہ کم ہے ؟ "

" اس کا حساب مستقبل کے کھاتے میں ہے ۔ "

" میں اتنا جانتی ہوں کہ خون رائیگاں نہیں جاتا اور ایک دن یہ علاقہ اپنا اعتماد ضرور بحال کرلے گا ۔ "

" بیٹی انھیں آرام کرنے دو ۔ صبح میں باتیں کرلینا" ——— ماں اُٹھتی ہوئی مریم سے کہتی ہے اور دونوں کوٹھری میں چلی جاتی ہیں ۔

آسمان پر سورج ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوا تھا ۔ صبح کی دیوی کا آنچل چاروں طرف لہرا رہا تھا ۔ تاحد نگاہ پھیلے ہوئے حسین مناظر سپاہی اپنی آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے تو اُس کی روح گنگنا اُٹھتی ہے ۔ اس نے اپنے زخم کو ٹٹولا ۔ درد کی ایک ٹیس اُبھرتی ہے ۔ تب ہی مریم چائے کا گلاس اُٹھائے اس کے پاس آتی ہے ۔

" کیا سوچ رہے ہیں ؟" ———

" سوچ رہا ہوں تم لوگ بڑے بلند حوصلہ ہو، دشمن کو بھی پناہ دیتے ہو" ——— سپاہی اس گھر کے اخلاق سے واقعی متاثر نظر آرہا تھا ۔

" یہ سب کیا اُلٹا سیدھا سوچنے لگے ؟" ——— مریم نے بات ٹالنی چاہی مگر سپاہی جذباتی ہو رہا تھا ۔

" مریم تمہارا بھائی کسی نہ کسی سپاہی کی گولی سے ہی تو مارا گیا ہوگا !"

" وہ مرا نہیں شہید ہوا ہے اپنے آدرشوں کے لئے ......اور ہمارے یہاں شہیدوں کا بڑا مرتبہ ہے" ——— وہ کچھ دیر رُکتی ہے ....

" ہاں اُسے شہید کرنے والا کسی نہ کسی کا سپاہی ضرور ہوگا لیکن وہ سپاہی آپ نہیں ہوں گے ۔"

" یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو ؟"

" مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے !"

" اس علاقہ میں مجھے آئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے ۔ پورے طور پر یہاں کے لوگوں سے واقف بھی نہیں ہوں ۔"

" آپ نے اس عرصہ میں کتنے بے گناہوں کا خون بہایا ؟"

" تم جسے بے گناہ کہہ رہی ہو وہ ہمارے قانون کے مطابق دشمن سمجھا جاتا ہے ۔"

" اپنے علاقہ کو دشمنوں سے پاک کرنے کی جدوجہد کرنے والا خود دشمن کیسے ہوسکتا ہے ؟"

" مریم تم بھی کیا بحث لے کر بیٹھ گئی ہو ۔ ناشتہ بھی لگاؤ گی ؟ رات سے بھوکا ہے بیچارہ !" ——— ماں بھی آکر وہاں بیٹھ گئی ۔ "

ایک شام آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے تھے ۔ ہوا بڑی خوشگوار چل رہی تھی ۔ سپاہی اور مریم باہر اُسارے میں بیٹھے تھے کہ اچانک سپاہی نے مریم کی آنکھوں میں جھانکا ———

" ایک بات کہوں مریم ؟ "

" کہئے ۔ "

" تم سچ مچ بہت خوب صورت ہو ۔ "

مریم ایک دم سے شرما گئی ۔ اُس کے گال اور گلابی ہوگئے ۔ اُس نے نظریں نیچی کرلیں ۔

" تم خوب صورت بھی ہو اور بلند حوصلہ بھی ۔ ہر لڑکی میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں ۔ "

" جھوٹی تعریف کیوں کر رہے ہیں ۔ "

" میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ۔ آج ایسی لڑکیوں کی سخت ضرورت ہے جو مرد کے دوش بدوش مقابلہ کے میدان میں ڈٹ سکیں ۔ "

" مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا ۔ "

" ڈرنا بھی نہیں چاہئے ۔ "

" میں چلتی ہوں ۔ بہت کام پڑا ہے " ——— مریم جانے کے لئے اُٹھتی ہے تو سپاہی اُسے اشارہ سے رُکنے کے لئے کہتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے ———

" ہم دونوں مل کر کام کا بوجھ کیوں نہیں بانٹ لیتے ؟ "

" کیا مطلب ؟ " ——— مریم کا سوال لرز رہا تھا ۔

" ہم لوگ شادی کرلیں " ——— سپاہی کی سرگوشی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

" ہش ! ——— مریم دوڑ کر بھاگ گئی ۔

شادی کے بعد سپاہی محسوس کرتا ہے کہ مریم ایک جیتا جاگتا وجود ہے۔ اُس کے اندر بے پناہ پیار ہے تو بلندیوں کو چھونے کا حوصلہ بھی ہے۔ وہ اگر مرد ہوتی تو ہواؤں کا رُخ بدل دیتی۔ باپ اور بھائی کی قربانی کے بعد بھی وہ کہیں سے ٹوٹی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر جو جنگ اس علاقہ کے لوگ لڑ رہے ہیں یا جس منزل کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں کیا اس کی صبح ہوگی؟

سپاہی اس تذبذب میں بھی ہے کہ وہ کب تک یہاں چھپا رہے گا۔ آخر اُس کے فرض کا کیا ہوگا؟ اور اگر وہ اپنے محاذ پر واپس بھی گیا تو کیا اُس کی اُنگلی ٹرائیگر پر اِن جدوجہد کرنے والوں کے خلاف حرکت میں آسکے گی؟ تو پھر؟ تو پھر وہ کہاں جائے؟؟ ـــــــــ وہ پریشان ہو اُٹھتا ہے۔ اُسے مریم کے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے تھا اور اگر حالات کے تحت ٹھہرا بھی تھا تو پھر رشتہ جوڑے بغیر چلے جانا چاہئے تھا۔ مریم نے تو اُس کی سوچ ہی بدل دی ہے ـــــــــ'

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ـــــــــ مریم کوٹھری میں داخل ہوتی ہے۔

"مریم ایک بات میں کئی دلوں سے تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں۔ دراصل میرا فرض مجھے بُلا رہا ہے۔"

"یعنی آپ لوٹنا چاہتے ہیں؟؟" ـــــــــ مریم کی آواز بکھرنے لگی۔

"مریم ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ایک سپاہی ہوں اور پھر سپاہی گھر میں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ ادھر چند مہینوں میں مجھے احساس ہوا کہ جو جدوجہد تم لوگوں نے شروع کر رکھی ہے اس کو کمک ملتی رہنی چاہئے۔ لہٰذا اس گھر کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے میرا بھی جانا ضروری ہو گیا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔

میں جلد ہی واپس آؤں گا۔ اور ایک نئی صبح کے ساتھ واپس آؤں گا۔"

"میرا بھائی بھی یہی کہہ کر گیا تھا لیکن آج تک واپس نہیں آیا اور اب آپ جانا چاہ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آنسوؤں کے سیلاب میں بہ جاؤں؟"

"مریم اطمینان رکھو۔ تمہارا پیار بے لوث ہے اس لئے فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔"

مریم رو پڑتی ہے ———

"میں اپنے باپ کی موت پر اتنا نہیں روئی کیوں کہ بڑا بھائی موجود تھا۔ جب وہ سہارا بھی چھن گیا تو میں خوب روئی۔ پھر آپ آئے تو میں نے ایک نئی زندگی شروع کی اور یہ سمجھا کہ وقت نے تلافی کے طور پر آپ کو بھیج دیا ہے۔ لیکن اب آپ بھی چلے جایئے گا تو رونے کے لئے میرے پاس آنسو بھی نہیں بچے ہیں۔"

"مریم! میں جو جنگ لڑنے جا رہا ہوں اُس کا انجام تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس جنگ کا ایک مناسب فیصلہ وقت ضرور کرے گا۔"

"میں جنگ سے نہیں ڈرتی اُس کے انجام سے ڈرتی ہوں"———

وہ سسک پڑتی ہے ——— "میرا بھائی بھی ایک جنگ لڑنے گیا تھا مگر آج تک واپس نہیں آیا، اور اب آپ؟ ......"

سپاہی اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔

"مریم تمہارا پیار اور تمہارا وجود دونوں اتنے پُرکشش ہیں کہ مجھے واپس آنا ہی پڑے گا۔ بس مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔"

مریم خاموش ہو جاتی ہے اور سپاہی چلا جاتا ہے۔

اور پھر یوں ہوا کہ لمحے دن اور دن مہینے میں تبدیل ہونے لگے ـــــ مریم کو اپنے اندر ایک اور وجود کا احساس ہونے لگا تو اس نے اس کی اطلاع اپنی ماں کو دی۔ ماں کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ وہ کہنے لگی ـــــــ
" آنے والا بھی یقیناً ایک ہونہار سپاہی ہوگا! "
مریم کو یاد آیا۔ سپاہی نے جاتے وقت کہا تھا کہ جو جدوجہد ہم لوگوں نے شروع کر رکھی ہے اُس کو کمک ملتی رہنی چاہیے۔ مریم سوچنے لگی ـــــــ یہ جنگ تو اتنی جلد ختم ہوتی نظر نہیں آتی تو پھر اِس جنگ کے لئے نہ جانے کتنے مزید سپاہیوں کی ضرورت پڑے۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ تین سپاہی اب تک اس جنگ میں بھیج چکی ہوں اور چوتھا میرے پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔ اس جنگ میں اس کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے کیوں کہ جنگ تو ابھی جاری ہے ـــــ!

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

سایہ بہت گہرا ہو گیا ہے اور سامنے کی بیشتر چیزیں دھند میں ڈوب سی گئی ہیں۔ میں جو سینکڑوں میل کا لمبا راستہ طے کر کے اس گاؤں میں پہنچا ہوں تو میرے لئے ہر ڈگر، ہر راستہ، ہر چہرہ اجنبی بنا ہوا ہے!——
آسمان دھیرے دھیرے سیاہ بادلوں کے ترغہ میں گم ہوتا جا رہا ہے——
اب تک میں کئی دروازوں پر دستک دے چکا ہوں مگر میرے لئے سب بند نظر آتے ہیں۔ کسی کسی کھڑکی کی اوٹ سے کوئی صورت اُبھرتی ہے مگر فوراً غائب بھی ہو جاتی ہے——،

میں کہاں چلا آیا ہوں؟—— میری آواز جہاں تہاں سے ٹوٹ رہی ہے—— اب لوٹ بھی نہیں سکتا۔ دس بارہ میل کا کچّا راستہ طے کرو تو پھر پختہ سڑک، مگر اس اندھیری رات میں سواری بھی کہاں ملے گی؟ اس پر یہ مزید تاریک ہوتی رات، میں کہیں بھٹک نہ جاؤں——

اچانک ایک دروازہ کھلتا ہے اور ایک لڑکی کا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔
ایک ڈری ڈری سی، سہمی سہمی سی لڑکی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔
نہ جانے کیوں میں ذرا جھجکتا ہوں۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں اور پھر اس کے
قریب پہنچتا ہوں۔ وہ دروازے میں ایک طرف ہو جاتی ہے اور میں اندر داخل
ہوتا ہوں۔ اندر کھاٹ پر ایک بوڑھا لیٹا ہوا ہے۔ پھوس کی اس جھونپڑی
میں ایک لالٹین اپنی مدھم روشنی بکھیر کر جھونپڑی والوں کی فراخ دلی کا مظاہرہ
کر رہی ہے۔ وہ لڑکی دوسری طرف سے ایک کھاٹ لاکر بچھا دیتی ہے۔

"سہر سے آئے ہو؟" ——— اُس لڑکی نے سیدھا سوال داغا۔

"ایسے سمئے میں یہاں آنا ٹھیک ناہی ہے بابو!" ——— پھر وہ جھونپڑی
کی دوسری طرف بنے چولھے کے پاس گئی۔ المونیم کی پلیٹ میں دو روٹی اور کدو
کی سبزی پروس کر لائی ——— "ہم گریب لوگ اس سے جیادہ کھانے
کو کچھ نہیں دے سکتے۔ ہمرا بابا بیمار ہے۔ اُکرا حصّہ اِی ہے۔ او ہے بولا تو ہم
دروجہ کھولا اور کھانا پروسا۔" ———

پھر لڑکی باہر سے ایک لوٹا پانی لے کر آتی ہے اور میرے سامنے رکھ
دیتی ہے اور بوڑھے کے پیتانے بیٹھ جاتی ہے۔

میں نے اُس لڑکی کو غور سے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ اُس کے کان باہر
ہی لگے ہوئے ہیں۔ ایک بے نام سی بے چینی اُس کے اندر کروٹ بدل رہی
ہے۔ وہ عام آواز اور آہٹ پر بھی چونک پڑتی ہے اور میری طرف دیکھنے
لگتی ہے۔ میں کھانا کھانے لگتا ہوں۔

"یہاں کس لئے آئے ہو بابو جی؟ ——— جانتے نہیں کل ہی
یہاں بڑا کھون کھرابہ ہوا ہے" ——— وہ بوڑھے کی پھٹی ہوئی چادر

درست کرتے ہوئے گویا بات چیت شروع کرتی ہے ۔

"میں اُسی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے آیا ہوں ۔"

"کوئی اکھبار والے ہو گے ؟ اِی کھبر چھاپو گے کہ اِی جگہ بڑا کھون کھرابہ ہوا ہے ۔ پھوٹو بھی لے جاؤ گے ۔ بس ! ____ اُکرا سے لوگ جی اُٹھتئی ، گھر سب بن جات ؟ ...... ؟"

مجھے لگا اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور میں بالکل نروس ہو گیا ۔ میں نے جلدی سے کہا ____

"میں اخبار والا نہیں ، کہانی کار ہوں ، کہانی لکھتا ہوں ۔"

"تو تم اس کھون کھرابے کی کہانی بناؤ گے ۔ کا کا لکھو گے بابو جی ؟"

____ وہ زور سے ہنستی ہے ۔ اُس کی ہنسی میں بھی شعلے لپک رہے تھے ۔ میں کھانا ختم کر چکا تھا ۔ وہ میرے سامنے سے تھالی اور لوٹا اُٹھا کر لے جاتی ہے ۔ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا ۔ مجھے یہ لڑکی حالاتِ حاضرہ کا ایک بے حد مناسب عنوان نظر آئی ۔ وہ واپس آکر پھر میرے سامنے فرش پر بیٹھ گئی ۔ بوڑھا بھی جاگ گیا تھا مگر اُس کی آنکھوں میں ویرانی صاف جھلک رہی تھی ____ '

میں نے اُن ویران آنکھوں کو غور سے دیکھا تو مجھے بیتے ہوئے کل کی تصویریں ایک کے بعد دوسری گذرتی دکھائی دیں ۔ ....

سورج ابھی ابھی ڈوبا ہے ۔ دھندلکا لمحہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا ہے ۔ لوگ باگ اپنے اپنے کام سے لوٹ کر گھروں میں روٹیوں کا انتظام کر رہے ہیں ۔ تبھی دور سے لگاتار گولیاں چلنے کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں ۔ لوگ دم سادھ لیتے ہیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں ۔ خوف گرم ہوا کی طرح

گاؤں کے لوگوں کو چھو کر گذر جاتا ہے اور پھر تڑ اتڑ گولیاں ـــــــ وحشت، خوف اور بے بسی کے خیمے نصب ہو جاتے ہیں۔ لڑکے بلبلا رہے ہیں۔ عورتیں چیخ رہی ہیں اور بوڑھے کانپ رہے ہیں۔ آگ کی لپٹوں کا علم بلند کئے، پاگل ہوائیں گاؤں کے ایک بڑے حصّہ کو اپنی زد میں لے لیتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ظلم کی اس رات کے پاس دُور دُور تک اُجالے کا نام و نشان نہیں۔ سارے گاؤں میں وحشت کے پجاری، ننگے شیطانوں کا رقص جاری ہے۔ وقت کا دامن تار تار اور لہو لہو ہے۔ عورت، مرد، بچے اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں ؟

اِس بھیانک ستم زدہ رات کا انت کہاں ہے ؟ کب تک یہ کلاس وار ہوتا رہے گا ؟ ـــــــ اس طرح کے اسٹرگل میں آدمی ہی تو مرتا ہے۔ آدمی خواہ کسی کلاس کا ہو آدمی آدمی ہوتا ہے۔

ایک عورت درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ جسم سے ٹپک کر لہو اُس کے کپڑوں کو سُرخ کر دیتا ہے۔ درد کی شدت لمحہ بڑھتی جاتی ہے اور وہ گھرے بے رحم اندھیرے میں اپنے وجود کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں ایک گرتی دیوار کی زد میں آجاتی ہے اور وہ بوڑھا جو اس وقت سامنے کھاٹ پر لیٹا موت سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ بھی اُسے نہیں بچا پاتا ـــــــ ! ملبے کا ڈھیر بنا گاؤں اُس کی آنکھوں سے منتقل ہو کر میرے تصور میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ مضطرب اور بے چین دل میرے سینہ میں بڑی تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اُس عورت کی آخری چیخ کتنی بھیانک تھی۔ اُس چیخ کو ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی برقی لہریں دور دور تک نہیں پہنچائیں گی۔ یہ نیم جاں لیٹا ہوا باپ اور یہ سہمی ہوئی لڑکی جانتے ہیں کہ اس کے گھر کے ایک اہم فرد کے

سینہ میں بھالا پیوست کرنے کا پلان بنانے والے شہر کی چکنی چکنی سڑکوں پر چلتے ہیں ۔ پھر بھی یہ اُن کا ظرف ہے کہ اندھیری رات میں شہر کے ایک اجنبی کو آواز دے کر وہ گھر میں بلا لیتے ہیں اور اپنے حصّے کا کھانا اُس کے آگے رکھ دیتے ہیں ۔!

میں اپنا زخمی دل لئے لوٹ آیا ہوں ۔ کاغذ کے اوراق میرے ٹیبل پر بکھرے پڑے ہیں، قلم میرے ہاتھ میں ٹھہرا ہوا ہے اور ذہن میں وہ سارا منظر ہے

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

جب تک میں ایک کہانی مکمّل کر رہا ہوں گا کوئی دوسرا گاؤں جل اُٹھے گا ...... کسی شہر کا کوئی محلہ ویران ہو جائے گا ۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ، آگ اور خون ، چیخ اور پکار ، خوف اور دہشت کے قدم بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اخباروں میں محض رپورٹ ، محض مذمّت اور بس !

بھگوان کے نام پر

اِس شہر میں شاید اُس عورت کا نہ کوئی دوست تھا نہ کوئی رشتہ دار،
اُسے آئے کئی ماہ ہو گئے تھے اور اُس نے یا تو کسی کو اپنا شناسا بنانا ضروری نہیں
سمجھا، یا اُسے تنہائی پسند تھی یا تنہا جینے کا حوصلہ تھا ——— !
وہ مکان جس میں وہ رہ رہی تھی ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ دو بیڈ روم مع ٹائیلٹ
اور کیچن اور ایک برآمدہ اس کے استعمال میں تھے۔ باقی حصّے ادھورے پڑے
تھے ——— ڈاکٹر سکینہ کا عالی شان مکان اُس کے بغل میں تھا۔
امتیاز علی انجینئر کا دلکش فلیٹ اُس کی بائیں جانب تھا، سامنے رجب علی اخباری
نمائندہ کا چھوٹا موٹا مکان تھا۔ رجب علی کے قریب امرناتھ رہتا تھا اور اُس
سے تھوڑا سا ہٹ کر آگے گلی کے نکڑ پر جوّن کا گھر تھا۔ جوّن کے گھر کی پشت پر
بلونت سنگھ کا مکان تھا۔ اس طرح یہ علاقہ بظاہر ہندوستان کی ایکتا کی تصویر
تھا ——— !

رجب علی کے مکان کی داہنی جانب ایک غنیمت قسم کا چائے خانہ تھا جہاں اکثر و بیشتر محلے کے لوگ فرصت کے اوقات میں بیٹھتے اور شہر سے لے کر ملک اور عالمی سیاست پر خوب باتیں کرتے۔ ثقافت، کھیل، فلم کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر جم کر بحث ہوتی لیکن انجام چائے کی پیالی کی طرح ہوتا۔ نوکران کی پیالیوں کو اُٹھا کر لے جاتا، صاف کرتا اور دوسرے گاہکوں کے سامنے تازہ چائے ان ہی پیالیوں میں پیش کرتا اور پینے والے پھر کوئی نیا موضوع لے کر بیٹھ جاتے ــــــ!

"مجھے تو لگتا ہے یہ عورت کسی اسکول میں ٹیچر ہے ــــــ" رجب علی کا آج کا موضوع وہ عورت تھی جو پڑوس کے دو کمروں کے فلیٹ میں آکر رہی تھی۔

"نہیں رجب بھائی!" ــــــ امرناتھ چائے کی پیالی اُٹھاتا ہے ــــــ "میں سمجھتا ہوں یہ کسی ہسپتال میں نرس ہے۔"

"تم دونوں کا اندازہ غلط ہے، یہ کسی چرچ کی خدمت گذار لگتی ہے، دیکھتے نہیں ہر وقت سفید کپڑوں میں ملبوس رہتی ہے اور بہت ریزرو بھی ہے" ــــــ جون ایک سگریٹ جلاتا ہوا اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے۔

"اس کا نام کیا ہے؟ تم لوگوں کو پتہ ہے؟" ــــــ بلونت سنگھ نے گفتگو کو ایک نیا رُخ دیا ــــــ

"جب چرچ میں خدمت گذار ہے تو ضرور اس کا نام میری یا جولی ہوگا" ــــــ جون ایک لمبا کش لیتا ہے۔

"اس کا نام ساوتری بھی تو ہو سکتا ہے؟" ــــــ امرناتھ نے چائے کی چسکی لی۔

" ہاں ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے "_____ رجب علی کسی سوچ میں گُم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

" کیوں نہ ہم لوگ اُس سے دریافت کریں ؟ "_____ بلونت سنگھ نے اپنی تجویز پیش کی۔

" پاگل ہوگئے ہو ؟ بے تقریب ملاقات چہ معنی دارد ؟ وہ اکیلی ایک بچّے کے ساتھ رہتی ہے۔ نہ اُس کا شوہر ہے اور نہ کوئی رشتہ دار۔ ہم لوگوں کو غلط بھی سمجھ سکتی ہے "_____ رجب علی نے ایک قاعدے کی بات کہی اور سب خاموش ہو گئے۔

دھوپ بہ نسبت سخت تھی اور ہوا گرم۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود رجب علی، امرناتھ، جون اور بلونت چائے خانہ میں بیٹھے تھے۔

" علی بھائی ! مجھے تو یہ عورت بہت مغرور نظر آتی ہے، آخر محلّے میں اور بھی تو لوگ ہیں۔ کیا وہ آپس میں باتیں نہیں کرتے یا ایک دوسرے سے نہیں ملتے لیکن اس کا انداز ہی نرالا ہے۔ صبح نَو بجے گھر سے بچّے کو لے کر نکل جانا اور شام چھ بجے واپس آکر گھر میں بند ہو جانا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے "_____ امرناتھ پھر اُس عورت کی گفتگو لے کر بیٹھ گیا۔

" یار امر ! زندگی گذارنے کا سلیقہ مختلف لوگوں کا مختلف ہوتا ہے۔ کوئی بھیڑ پسند کرتا ہے کوئی تنہائی۔ ہم کسی کی ذاتی زندگی میں کیوں دخل دیں؟" رجب علی نے امر کو سمجھایا۔

" اس میں دخل دینے کی کیا بات ہے۔ بات چیت ہوتی تو یہ اندازہ ضرور

ہو جاتا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔" جون نے ایک نکتہ نکالا۔

"واہگرو نے کہا ہے۔ سب کا مالک ایک ہے" ——— بلونت سنگھ کا خلوص اُمڈ آیا۔

یہ تو صحیح ہے کہ سب کا مالک ایک ہے لیکن ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی مذہب ضرور ہوتا ہے۔ اس کی شناخت عام طور پر اسی سے ہوتی ہے" ——— امرناتھ نے مذہب کا علم لہرایا۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا بلونت سنگھ اُٹھ گیا ——— "اب چلنا چاہیے کافی وقت ہو گیا ہے۔

چائے خانہ سے نکل کر جب وہ اُس عورت کے فلیٹ کے قریب سے گذرنے لگے تو انہوں نے چند لوگوں کو تشویش کے عالم میں اُس فلیٹ کے پاس کھڑا پایا۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے بچے کے مسلسل رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رجب علی نے آگے بڑھ کر دروازہ پر دھیرے سے دستک دی لیکن جواب ندارد۔ پھر دروازہ زور زور سے پیٹا گیا مگر کوئی رسپونس نہیں ملا۔ بچہ روئے چلا جا رہا تھا۔ بالآخر اتفاق رائے سے دروازہ توڑ دیا گیا۔ سبھی لوگ اندر داخل ہوئے۔ عورت پلنگ پر سوئی تھی اور اُس کے قریب لیٹا بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ علی نے لپک کر بچے کو اُٹھا لیا اور اُسے بہلانے لگا۔ جون اُس عورت کی نبض دیکھنے لگا۔

"کچھ پتہ نہیں چلتا ڈاکٹر کو فون کرو۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر وہاں آگیا۔ اُس نے عورت کا بہ غور معائنہ کرنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ ——— وہ تو چار پانچ گھنٹہ قبل ہی مر چکی ہے۔"

"کیا؟" ——— علی نے پہلے بچے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

" علی بھائی اب کیا ہوگا؟" ——— بلونت سنگھ کا لہجہ تشویش میں ڈوبا ہوا تھا۔

" ہونا کیا ہے۔ اس کا کوئی وارث تو ہے نہیں۔ اس کی تجہیز و تکفین میں کر دیتا ہوں" ——— علی نے انسانی ہمدردی کے ناتے تجویز پیش کی۔

" واہ! کیا میں اس کا آخری سنسکار نہیں کر سکتا" ——— امر نے علی پر سبقت لے جانے کی غرض سے اپنے حوصلہ کا اظہار کیا۔

" میں بھی اس کے کفن دفن کا انتظام کر سکتا ہوں" ——— جون بولا۔

تو کیا میرے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ میں اس کا داہ سنسکار کروں" بلونت سنگھ کا لہجہ تیز تھا۔

" ٹھیک ہے ہم چاروں مل کر آخری رسوم انجام دیں گے" ——— رجب علی نے جھگڑے کا ایک حل پیش کیا۔

" نہیں میں کسی کو اس کام میں شریک نہیں ہونے دوں گا۔ میں تنہا اس لائق ہوں کہ سارا بوجھ اُٹھا سکوں" ——— امر ناتھ نے ایک طرفہ اعلان کر دیا۔

" میں کیا غریب یا مفلس ہوں کہ اس کا کفن دفن اکیلے نہیں کر سکتا۔ میں خود سب کچھ کروں گا" ——— جون نے بھی تیور دکھائے۔

" تم لوگ کیوں جھگڑتے ہو۔ میں نے تو انسانی ہمدردی کے ناتے تجویز پیش کی تھی۔ تم لوگ مذہب کی بات لے آئے۔ اگر ایسی بات ہے تو تم لوگ ہی اس کا کفن دفن کرو، میں تم لوگوں کی مدد کروں گا" ——— رجب علی نے پھر صلح صفائی کی بات کی۔

" ٹھیک ہے میں کر دیتا ہوں" ——— جون بولا۔

" نہیں میں کروں گا" ______ بلونت سنگھ نے ضد کی۔

" نہیں تم دونوں نہیں کر سکتے کیونکہ تم دونوں دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہو اور یہ عورت ہندو ہے" ______ امرناتھ نے معاملہ کو اور اُلجھا دیا۔

" یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہندو ہے ؟ کیا اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ یہ کرسچن ہے اور کسی چرچ کی خدمت گزار ہے۔ اس لیے ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھی اور دیکھو ابھی بھی اس کے بدن پر سفید کپڑا ہے"۔ ______ جون نے امرناتھ کو للکارا۔

" تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کرسچن ہے، یہ مسلمان بھی تو ہو سکتی ہے" ______ علی کو بھی غصّہ آگیا۔

" اوئے ! سفید کپڑے سے کیا مطلب ؟ سفید کپڑا تو ہر مذہب میں پہنا جاتا ہے۔ یہ ضرور سکھ ہے اسی لیے تنہا ہمّت سے رہ رہی تھی" ______ بلونت سنگھ بھی آگے آیا۔

چائے خانہ میں چائے کی چُسکیوں کے درمیان جو دوستی پھلتی پھولتی رہی تھی۔ اچانک اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کوئی کسی کی دلیل سُننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا اور نہ اس کے لیے تیار تھا کہ کوئی دوسرا لاش میں ہاتھ لگائے۔

اس کے باوجود بچّہ علی کے شانہ سے لگا سو رہا تھا ______ !

کتنے ہی لوگ آئے اور اپنے اپنے طور پر عورت کی شناخت کرنے کی کوششیں کیں مگر واضح ثبوت کے بغیر کوئی کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ فلیٹ کا کونا کونا دیکھا گیا۔ مگر نہ تو اس عورت کا واضح نام سامنے آیا نہ کوئی ایسی نشانی جس کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جاتا ______ !

" اس لاش کو محض دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اس کا تعلّق کس

مذہب سے ہے"۔ ——— بڑی مسجد کے مولانا کرامت علی بھی ناکام ثابت ہوئے۔

"مرنے سے پہلے یہ استری اگر مجھ سے دو چار باتیں کرلیتی تو میں ضرور بتادیتا کہ یہ کس دھرم کو ماننے والی ہے" ——— پنڈت جی نے بھی لاش کو دیکھ کر مایوسی سے سر ہلایا۔

"گوڈ کیسا کیسا لوگ بناتا ہے جو پرابلم ہی پرابلم کھڑا کر دیتا ہے" ——— فادر ولیم نے بھی اس عورت کی شناخت میں اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

"یہ عورت پہلی بار جب میرے پاس مکان کرایہ پر لینے آئی تھی تو اس کے ساتھ سونو پھل فروش تھا جس نے اس عورت کے طور طریقہ کی بڑی تعریف کی تھی اور اس کا نام ڈولی بتایا تھا اور کہا تھا کہ یہ سورج کنڈ کی رہنے والی ہیں۔ ہر ماہ کرایہ وقت پر مل جاتا تھا اس لئے کبھی مزید پوچھ گچھ کی ضرورت پیش نہیں آئی"۔

پولس انسپکٹر نے جب سونو پھل فروش کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ بمبئی گیا ہوا ہے اور ایک ہفتہ سے پہلے اس کے واپس آنے کی امید نہیں۔ تھک ہار کر پولس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوادی اور جو لوگ دھرم کے نام پر اس عورت کی لاش حاصل کرنا چاہتے تھے اُنھیں پولس اسٹیشن پہنچنے کی ہدایت ملی ———،

ڈولی اگر اس عورت کا نام تھا تو اس کے دھرم پہ روشنی نہیں پڑتی۔ ڈولی، ببلی، پنکی، رنکی، روزی، گڑیا، ببی وغیرہ اتنے کومن نیم ہیں کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب ان ناموں کو رکھ لیتے ہیں۔ اب رہا پوسٹ مارٹم کے بعد کی رپورٹ کا سوال! ——— تو پوسٹ مارٹم کا عمل فزیکل باڈی کا مطالعہ ہے۔ اُسے جذبات، عقیدہ اور آرزوؤں سے

کوئی مطلب نہیں لہٰذا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد بھی گاڑی جہاں تھی وہاں رُکی رہی ــــــــــ'

پولس اسٹیشن پر موجود لوگوں میں جون بھی تھے، رجب علی بھی، بلونت سنگھ بھی اور رام ناتھ بھی۔ اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں کو پولس کے فیصلے کا انتظار تھا کہ لاش کس کے حوالے کی جاتی ہے اور بچہ ....

پولس انسپکٹر مسکراتا ہوا مجمع کے قریب آ کھڑا ہوتا ہے اور رام ناتھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس عورت کے دھرم کا پتہ نہیں چل سکا اور نہ ہی کوئی اس کا قانونی وارث موجود ہے اس لیے اس لاوارث لاش کو میڈیکل کالج ہاسپٹل کو دے دیا گیا اور بچہ ....

انسپکٹر معنی خیز انداز میں مزید مسکرایا ......اور بچہ ...... میرے گھر ہے۔ میری بیوی نے اُسے گود لے لیا ...... اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

" آپ نے بچہ لے لیا ؟ آپ کا دھرم ؟" ــــــــ امرناتھ نے تُرش لہجے میں انسپکٹر سے سوال کیا۔

" دے دو بھگوان کے نام پر ...... دے دو بابا اللہ کے نام پر۔ " ــــــــ مجمع دیکھ کر ایک بھیک مانگتا چھوٹا لڑکا پولس اسٹیشن کے احاطہ میں چلا آتا ہے۔

انسپکٹر امرناتھ سے کہتا ہے کہ " جاؤ اس لڑکے کے دھرم کا پتہ چلاؤ۔ اس سے اچھا ہے کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے پال پوس کر بڑا کرو، یہی کام آئے گا۔"

امرناتھ حقارت سے اُس لڑکے کی طرف دیکھتا ہے اور غصہ میں کچھ بھنبھناتا ہوا پولس اسٹیشن احاطہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے سب ہی باہر

چلے جاتے ہیں اور وہ بھیک مانگتا لڑکا حسرت سے سب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جانے والوں میں جون، رجب علی اور بلونت سنگھ بھی شامل تھے،
انسپکٹر کبھی جانے والوں کو اور کبھی اُس مفلس لڑکے کو دیکھتا ہے اور پھر کچھ سوچ کر اس لڑکے کے ہاتھ پر چند سکے رکھ دیتا ہے۔ اُن سکوں کی چمک سے اُس لڑکے کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ تیر کی طرح ایک قریبی چائے خانہ میں داخل ہو جاتا ہے ——————!

مریادا اور تانڈو رقص

مَیں سب دیکھ رہا ہوں ________،

قدیم ترین دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔

سب کچھ ملبہ میں تبدیل ہو چکا ہے ________،

________ اور میں ملبہ کے پاس تھکا تھکا کھڑا ، سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ دیکھنے کا یہ عمل مسلسل کئی دنوں ، کئی ہفتوں سے نہیں، کئی برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ لمحہ لمحہ گم شدگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور دیکھنے کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے ________،

مَیں اور ملبہ ________،

ملبہ میرے ذہن پر اس طرح نقش ہو چکا ہے جس طرح اپنے آدمی ہونے کا احساس! ________

آدمی، ملبہ، احساس ________ احساس بڑھتا جاتا ہے۔ ملبہ

جو اس پر پھیلتا جاتا ہے اور آدمی میرے اندر گہرائی تک اُترتا جاتا ہے۔
میں ملبہ کو غور سے دیکھتا ہوں جہاں اب اینٹوں اور ٹوٹے پتھروں کا انبار لگا ہوا ہے ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے ملبہ کے اوپر کئی انسانی ڈھانچے اُبھر آتے ہیں۔ ایک ڈھانچہ ، دو ڈھانچہ ، تین ڈھانچہ اور پھر بہت سے ڈھانچے ...... ہر طرف ڈھانچے ہی ڈھانچے ـــــ
میں اتنے سارے ڈھانچوں کو حیرت سے دیکھتا ہوں اور سوچ میں پڑ جاتا ہوں......... یہ ڈھانچے کہاں سے آگئے ؟...... اوہ !......... یہ صدیوں سے کیا یہاں تھے !........ ڈھانچے ہی ڈھانچے .... میں دیکھتا ہوں ...... ڈھانچوں میں جنبش ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ڈھانچے حرکت کرنے لگتے ہیں اور ایک عجیب سا شور پیدا ہونے لگتا ہے۔ میں قدرے خوف زدہ سا ایک گوشے میں کھڑا ان ڈھانچوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔
اُس وقت میری تشویش کی انتہا نہ رہی جب سارے ڈھانچے اپنے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر بے ہنگم ناچ شروع کر دیتے ہیں۔ میں ہکّا بکّا بے ہنگم ناچ دیکھ رہا ہوں۔ ڈھانچے ہیں کہ ناچ اور شور شرابے میں مشغول ہیں۔ میں خوف اور حیرت کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا لیکن پھر اپنے خوف کو جھٹکتا ہوں اور بے حد توانا ہو کر چیختا ہوں ـــــ
"کون ہو تم لوگ ؟"
ایک ڈھانچہ قہقہہ لگاتا ہے ـــــ'
" میں اینٹ (ماضی) ہوں۔ تمہارے پُرکھوں نے مجھے یہاں بندی بنا کر دیواروں میں چُنوا دیا تھا۔ سات سو سال تک ہم لوگ ان دیواروں میں قید رہے۔ اب ساری دیواریں منہدم ہو چکی ہیں اور ہم سب آزاد ہیں۔ تمہارے پُرکھوں کی

بنائی نشانی کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے کہ یہ ہماری غلامی کی علامت تھی۔"

مَیں متعجب کھڑا سارا منظر اپنی آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔
ڈھانچوں کا بے ہنگم رقص اُسی طرح جاری ہے! توانا ڈھانچے گلے مِل رہے ہیں، ہنس رہے ہیں اور ایک دوسرے کو بدھائیاں دے رہے ہیں، ایک توانا ڈھانچہ باآوازِ بلند کہتا ہے:

" ہمارے سینکو! آج تم لوگوں نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو ہمارے پُروج بھی نہیں دے سکے۔ آج یقیناً ہمارے پُروجوں کی آتما کو شانتی مِل گئی ہوگی۔ آج یہ دِرشیہ (منظر) دیکھ کر آکاش بھی گدگد ہوگیا ہوگا تو آؤ ہم اس جشن کو سارے دیش میں منائیں۔ "

اور اندر پرستھ کے قدیم و جدید نگروں میں سُرخ جشن منایا جانے لگا .... سُرخی .... سُرخی .... اور صرف سُرخی ..... انسانیت سُرخی میں شرابور ..... مذہب سرخی میں لت پت ..... اور زبان سُرخی تھوکتی ہوئی!!!

انصاف کا کانٹا جنبش کرتا ہے ______

" قدیم ترین دیواریں منہدم کرنے والوں کو ایک دن کا کارادس! "

بزدل قوم کا بزدل رہنما چیختا ہے ______

" یہ انصاف نہیں' بازیچۂ اطفال ہے! ۔ انہیں سزائے موت ملنی چاہیئے۔ یہ ہماری شناخت پر حملہ ہے۔ ہمارا وجود خطرے میں ہے۔ نوجوانو! اُٹھو.... کچھ کرو.......

______ سینک آئے اور سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان خالی تھا۔ رہنما بھی رُوپوش اور قوم بھی رفوچکر! ______ کہیں ایک پرندہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔

میں سب دیکھ رہا ہوں۔

دُور ——— ایک ڈرائنگ روم میں چند لوگ گپ شپ کر رہے ہیں ———،

" اب کوئی معجزہ بھی ظہور میں نہیں آتا! — ابابیل کا جھُنڈ بھی نہیں آتا!" ——— ایک آدمی چائے کی چُسکی لیتا ہے۔

" جو بھی معجزہ یا کرشمہ ہوا ہے وہ آخرالزماں کے عہد کے آس پاس ہوا ہے۔ جب وہ رُخصت ہوگئے تو معجزات اور کرشموں کا دروازہ بند ہوگیا۔ انھوں نے معجزات کے بدل کے طور پر انقلابِ عمل کا نسخہ دیا، اور ایک مکمل نظامِ حیات پیش کر دیا تھا" ——— دوسرا آدمی سمجھاتا ہے۔

" تب کوئی محمد بن قاسم یا طارق بن زیاد کیوں نہیں نمودار ہوتا؟"

——— تیسرے آدمی نے بات کو مزید آگے بڑھایا ———

" وہ لوگ کوئی فرشتہ نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے عزم اور حوصلے سے وہ کارنامے انجام دیئے جنھیں ہم یاد کر رہے ہیں۔ ہم میں سے بھی کوئی طارق اور قاسم بن سکتا ہے" ——— پہلے شخص نے اپنے جانتے ایک نیا نظریہ رکھا۔

" بھائی کون بنے گا؟ ہر آدمی تو حالات سے نبرد آزما ہے۔"

" جب پانی سر کے اوپر سے گذرنے لگے گا تو حالات کوئی بھی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ میرے بھائی جس طرح یہ فرقہ پرستی کا زہر پھیل رہا ہے۔ ہماری شناخت اور وجود دونوں خطرے میں ہیں۔ ہم کیوں یہ سوچتے ہیں کہ طارق اور قاسم ہمارا پڑوسی ہی بنے۔ ہم کیوں نہیں بن سکتے؟ یہ جذبہ

اگر پیدا ہو گیا تو گھر گھر سے ایک طارق اور ایک قاسم نمودار ہوں گے" ——
تیسرے شخص نے ایک لمبی تقریر جھاڑ دی ۔
آج کی بحث کو یہیں پر ختم کرو بھائی ۔ میں تو چلا ۔ ٹی ، وی پر ہندوستان پاکستان کا میچ آرہا ہے ۔" —— دوسرا آدمی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے ۔
" میں بھی چلا ۔ زی ۔ ٹی ۔ وی پر آج بہت اچھی فلم آنے والی ہے" ——
پہلا آدمی بھی چلا جاتا ہے ۔
" مجھے بچّوں کو اسکول لینے جانا ہے ۔ میں بھی چلتا ہوں" ——
چوتھا شخص بھی صوفے سے اُٹھتا ہے ۔
میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں ——'
بھگتوں کی بھگتی کو ہوا ملتی رہتی ہے ۔ نعروں کا آکسیجن اور اکھنڈ نظریات اُن کے جسم اور دماغ میں پیوست کیے جاتے ہیں —— پھر اندر پرستھ کے دارالخلافہ پر بھگتوں کا پرچم لہرانے لگتا ہے اور عوام قومی ایجنڈا اور خفیہ ایجنڈا کے دلدل میں پھنستے چلے جاتے ہیں ۔
مَیں سب دیکھ رہا ہوں ! ——'
پوکھران میں ایٹمی دھماکہ !
امریکہ کے ذریعہ معاشی پابندی عائد !!
اور آسمان چھوتی گرانی !!!
" یہ سرکار نہیں چلے گی" —— چائے کی دُکان میں کئی نوجوان بیٹھے محوِ گفتگو ہیں ۔
" سرکار کسی کی رہے ، ہم غریبوں کو اِس سے کیا فائدہ ؟ سرکار تو امیر لوگ بنواتے ہیں ۔ ہم تو کل بھی صرف تماشائی تھے ، آج بھی تماشائی ہیں ۔

غریبوں کے مسائل حل کرنے کی پالیسی نہ نہرو کے پاس تھی نہ باجپائی کے پاس ہے "______ ایک پڑھا لکھا سا آدمی اپنا خیال پیش کرتا ہے۔

" اب اس دیش کا کیا ہوگا ؟ ؟ "______ ایک نوجوان بولا۔

" آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ؟ "______ دوسرا نوجوان گنگنایا۔

" کہیں دیش خونی انقلاب کی طرف تو نہیں بڑھ رہا ہے ؟ "
اُس نوجوان نے تشویش کا اظہار کیا۔

" وہ کیسے ؟ "______

" افراتفری، بھرشٹاچار، لُوٹ، غنڈہ گردی اور دہشت گردی نے عام لوگوں کا جینا مشکل کر دیا ہے "______ پہلا نوجوان بولا۔

" ابھی اور مشکلات بڑھیں گی۔ ہم بھی اپنے وقتی فائدے کے لیے اُن ہی لوگوں کی پناہ میں چلے جاتے ہیں "______ دوسرا نوجوان فکر مند دکھائی دیتا ہے۔

" ہمیں اُس کے لیے مجبور کر دیا گیا ہے "______ تیسرا نوجوان بولا۔

" کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ہمیں ہر کام خود سے کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ حالات سے لڑنا تو ہوگا۔ گمراہ لوگوں کی مخالفت تو کرنی ہوگی ہی۔ "
______ اُس نوجوان کے لہجے میں عزم جھلک رہا تھا۔

" ایک بات بتاؤ، مندر وہیں بنے گا نا ؟ "______ تیسرے نوجوان نے وضاحت چاہی۔

" آپ کو مندر کی فکر ہے۔ دیش بھوک مری کی کگار تک پہنچ گیا ہے۔ مندر سے پیٹ بھر جائے گا ؟ "

" لیکن ہم نے تو ووٹ اسی لیے دیا تھا کہ مندر وہیں بنے گا۔ " تیسرا

نوجوان بتدریج جذباتی ہو رہا تھا۔

" اور آپ کو بھوک کی کوئی فکر نہیں ؟" ——— وہ نوجوان بولا۔

" آدمی محنت مزدوری کر کے کسی طرح پیٹ تو بھر ہی لیتا ہے"

تیسرا نوجوان بولا۔

" کیا پیٹ بھر لینا ہی زندگی ہے۔ کیا اس سے دیش خوش حال ہو جائے گا"

——— وہ نوجوان بولا۔

" بھائی دیش خوش حال ہو یا نہ ہو، ہماری تو اِچّھا ہے کہ مندر اُسی استھان پر نرمان ہو جہاں .... تھی" ——— تیسرا آدمی جوش میں بولا۔

" مندر بننے میں اب کچھ دیر نہیں۔ پتھر تراشنے کا کام زوروں پر چل رہا ہے، جس دن یہ کام پورا ہو جائے گا۔ کارسیوک پتھّروں کو جوڑ کر مندر بنا دیں گے" ——— دوسرا نوجوان بولا۔

" لیکن وِرودھی دَل کے لوگ بہت چیخ پکار کر رہے ہیں۔"

پہلا نوجوان قدرے فکر مند ہو گیا۔

" یہ تو اُن کی عادت ہے۔ اُس وقت بھی بہت چیخ پکار ہوئی تھی، لیکن کیا ڈھانچہ گرا نہیں ؟ اور سرکار نے کیا کر لیا ؟ نیا یالیہ کو کچھ کرنے کا موقع دیا گیا ؟ ؟ ۔ ایک دن کا کارادواس ! ہا ! ہاہا !! ہاہاہا !!! ہمارے نیتا تو کئی سال بھی جیل میں رہیں تو وہاں بھی اُن کے لیے عیش ہے!"

تیسرا نوجوان کھِل اُٹھا تھا۔

" اگر مندر بن گیا تو داؤد جیسے لوگ دھماکا ضرور کریں گے"

پہلے نوجوان نے تشویش کا ایک نیا دروازہ کھولا۔

"مندر کے لیے ہزار دو ہزار لوگوں کی بَلی تو دینی ہی پڑے گی" ـــــــ
دوسرے نے اُس دُروازہ کو بند کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن جن کی بلی پڑے گی اُن کے پریوار کا کیا حال ہوگا؟" ـــــــ
پہلے نے پھر لمحۂ فکریہ پیدا کیا۔

"ہوگا کیا؟ سرکار سے معاوضہ دلا دیا جائے گا، سب ٹھیک ہو جائیگا ـــــــ چلو اُٹھو! ـــــــ زیادہ مت سوچو، سب کچھ ہمارے حسب خواہ ہوگا۔"

اور پھر سب اُٹھ کر چلے گئے ـــــــ

میں سب دیکھ رہا ہوں اور سُن بھی رہا ہوں ـــــــ!

مَیں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا اپنے کمرہ میں آیا ہوں اور سوچ رہا ہوں ـــــــ

کل کے اخبار کی شاہ سُرخی کیا ہوگی؟؟

اندھیرے جاگتے ہیں

کامران کنارے بیٹھا بہت دیر سے ندی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا ہے اور اس کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ آسمان پر چاند آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ مگر کامران کے لیے وقت جیسے ٹھہر سا گیا ہے۔ وہ اِرد گِرد نظریں گھما کر آس پاس کی بے جان چیزوں کو دیکھتا ہے اور پھر بے چینی سے ندی کی سطح پر نگاہیں مرکوز کر دیتا ہے۔

یہ رات کب ختم ہوگی؟ ———

کامران سگریٹ نکالتا ہے اور ماچس کی تیلی سے سگریٹ جلا کر تیلی لہروں کی طرف اُچھال دیتا ہے۔ تیلی پل بھر میں بُجھ جاتی ہے اور ندی کی آغوش میں کھو جاتی ہے ——— وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہے، مگر احساس کی لہریں اس کے اندر تک سرایت کر گئی ہیں۔ دفعتاً چاروں طرف سے عالیہ کے الفاظ نے اس پر یلغار کر دی۔ ہر لفظ تیر کی طرح اُس کے

جسم میں پیوست ہو رہا تھا اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان الفاظ سے خود کو کس طرح محفوظ رکھے ــــــــ اُس نے آنکھیں بند کر لیں ــ زور سے میچ لیں ـ پھر کان میں اُنگلیاں ڈال لیں مگر کوئی فائدہ نہیں! ــ بے بسی سے اُس نے چاروں طرف دیکھا ـ وہاں کوئی نہ تھا ـ تب اُس کا جی بھر آیا ـ وہ جی بھر کر رونا چاہتا تھا مگر رو بھی نہ سکا ـ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور بے سوچے سمجھے گھر کی طرف چل پڑا ـ

راستے سنسان پڑے تھے ـ کبھی کبھی کوئی تیز رفتار ماروتی یا ایمبیسیڈر زنّاٹے کے ساتھ اُس کی بغل سے نکل جاتی ـ آس پاس کی عمارتوں سے برقی بلب کی روشنی جھانک رہی تھی ـ لیمپ پوسٹ کا بلب بھی روشن تھا ـ کبھی کبھی کوئی سائیکل سوار بلاوجہ گھنٹی بجاتا گزر جاتا ـ ایک دو آدمی بھی جلدی جلدی پیدل چلتے ہوئے کسی گلی میں گھُستے نظر آئے مگر زندگی کی دھڑکن کہیں نہیں تھی .... ان وسیع عمارتوں میں صرف ایک کمرہ میں ماں باپ اور بچے نہیں سوتے تو پھر یہ عمارتیں کیوں سہمی سہمی نظر آ رہی ہیں ؟ ــــــــ ایک تلخ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھری مگر اُس کے قدم آگے بڑھتے ہی رہے ــــــــ '

دروازہ شاید بند نہیں تھا ـ ایک ہی دستک پر کھُل گیا ـ اُس کی بیوی عالیہ بھی نہیں سو سکی تھی ـ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر جھُک گئیں ـ اب کہنے کے لیے کیا رہ گیا تھا ـ ؟ عالیہ آنسو روک نہ سکی ـ دو موٹے موٹے آنسو اُس کی پلکوں سے ڈھلک کر ساڑی میں پیوست ہو گئے ـ کامران بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گیا ـ کمرہ میں اُس کے دونوں بچے ڈبلو اور پنکی ایک ہی بستر پر سوئے خوابوں کی دُنیا کی سیر کر رہے تھے ـ بچوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اُس نے اپنے بستر کی طرف دیکھا ـ جس پر سفید چادر آج ہی ڈالی گئی تھی اور ساتھ ہی

تکیہ کا غلاف بھی بدل دیا گیا تھا۔ لیکن صرف ایک ہی تکیہ ؟ ———
اُسے حیرت ہوئی، پھر اُس کی نگاہ فرش پر لگے بستر کی طرف اُٹھ گئی۔ اُس نے پلٹ کر عالیہ کی طرف دیکھا۔ جو اُسے ہی دیکھ رہی تھی ———،

ایک بار پھر دونوں کی نگاہیں ملیں اور پھر خاموشی سے جھک گئیں۔!

"کھانا کھا لیجئے!" ——— عالیہ نے خاموشی توڑی۔

"نہیں بھوک نہیں ہے!" ——— کامران نے کپڑا تبدیل کیا۔ بچوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ عالیہ نے جب کامران کو لیٹے دیکھا تو خود بھی فرش پر لگے بستر پر لیٹ گئی۔ تکیہ سر کے نزدیک کیا اور چادر اپنے اوپر ڈال لی ———،

دونوں کی آنکھوں سے نیند کا خیمہ اُجڑ چکا تھا۔ بہت سارے سوالات اُن کے ذہن میں گونجتے رہے۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹے رہے۔ دونوں کی سوچ کی لہریں ایک ہی واقعہ کے گرد گردش کرتی رہیں۔ دونوں رہ رہ کر اُس واقعہ کے جال میں اُلجھتے رہے اور گھنٹوں باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے رہے ،

آج دوپہر میں، ———

عالیہ برآمدہ میں بیٹھی پنکی کا سوئٹر بننے میں مشغول تھی۔ دونوں بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ اچانک ڈبلو کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی ———

"پنکی کل رات تم نے کچھ دیکھا تھا ——— ؟"

"کل رات ؟ کیا ہوا تھا ؟ ؟"

"یہی کہ ممّی اور ڈیڈی میں لڑائی ہو گئی تھی" ——— ڈبلو کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

عالیہ کے کان کھڑے ہو گئے اور غیر شعوری طور پر اُس نے اپنے کان

اُن بچّوں کی طرف جُھکا لئے ــــــــــــ'

" لڑائی ہو گئی تھی؟ نہیں تو!" ــــــــ پنکی نے حیرت کا اظہار کیا ــــــــ

" تو سوئی تھی۔ ممّی نے پاپا کو دانت کاٹ لیا تھا" ــــــ ڈبلو نے اپنی جانکاری کی دھونس جمائی۔

" لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیکھا" ــــــ پنکی نے انتہائی سادگی سے کہا۔

" میں تو جب بھی جاگتا ہوں ...."

" ڈبلو!" ــــــــ عالیہ نے اُسے زور سے پکارا اور پھر غصّہ میں گرتی پڑتی اُس کے پاس پہنچ کر تڑاتڑ دو تھپڑ اُسے لگائے اور چیخنے لگی ــــ

" بدتمیز، نالائق، بدبخت، تیرا مُنہ جلادوں گی اگر آئندہ ......"

اور پھر وہ بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــــــــ'

دونوں بچّے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہے تھے ــــــ!

کامران حسب معمول شام میں دفتر سے لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں بچوں کی مَن پسند مٹھائی کا ڈبّہ تھا مگر اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ اُس کی آمد پر کوئی شور وغل نہ اُٹھا۔ اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھی سوچی سوچی سی نظر آئیں تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔

" کیا بات ہے؟ آج گھر میں اس قدر خاموشی کیوں ہے؟" ــــ اُس نے عالیہ کو روک کر سوال کیا۔

" کچھ نہیں ، آپ کپڑے بدلیے ۔ کوئی خاص بات نہیں ۔" ــــــ عالیہ کی آواز بدلی ہوئی تھی ۔ وہ آگے بڑھ گئی ۔

کامران نے بچّوں کی طرف دیکھا ۔ وہ سر جھکائے کیروسن لیمپ میں ہوم ورک کر رہے تھے ۔ کامران کو سب کچھ عجیب لگ رہا تھا ۔ مگر اُس سے زیادہ عجیب وہ لگا جب عالیہ نے اُسے ساری باتیں بتائیں ۔

وہ بُری طرح بوکھلا گیا ۔

اُسے سارا منظر اندھیرے میں ڈوبتا محسوس ہوا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے ــــــ !

ڈبلو آٹھ سال کا ہے اور رینکی صرف چھ سال کی ۔ دونوں ایک انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ اُن کی پڑھائی پر کامران کی آمدنی کا ایک حِصّہ صرف ہو جاتا ہے لیکن کامران کو احساس ہے کہ اُس کے والدین نے اُسے اعلیٰ تعلیم نہیں دلوائی ۔ اس لیے وہ آج ایک معمولی ملازم ہے اور ایک کمرہ والے مکان میں رہ رہا ہے لیکن وہ اپنے بچّوں کو اچھی تعلیم دلوانے کا حوصلہ رکھتا ہے تاکہ اُس کے بچّے کچھ بن سکیں ۔ خود معمولی کپڑا پہنتا ، عالیہ کو بھی معمولی کپڑے لاکر دیتا لیکن بچّوں کو کسی چیز کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیتا ــــــ '

" اُٹھئے گا نہیں ؟ ــــــ عالیہ کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی ۔

کامران جاگ گیا ۔ پتہ نہیں سوچتے سوچتے کب اُس کی آنکھ لگ گئی تھی ــ

اُس نے سب سے پہلے بچّوں کے بستر کی طرف دیکھا جو خالی تھا ــــــ '

" بچّے کہاں گئے ؟ ــــــ اُس نے بیوی سے دریافت کیا ۔

" اسکول !" ــــــ عالیہ کا مختصر جواب تھا اور پھر ایک منٹ سے بھی کم وقفہ میں اُس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی آگئی ۔ چسکیوں کے ساتھ ہی

پھر سوچ کا دروازہ کھُل گیا۔

اُس نے گھبرا کر جیسے تیسے چائے حلق میں اُنڈیلی اور باتھ روم میں داخل ہوگیا ـــــــــ،

"ناشتہ لاؤں؟ یا کھانا ہی کھایئے گا؟؟ گیارہ تو بج گئے ــــــــ!"

عالیہ نے چھوٹا ٹیبل اُس کے سامنے لگاتے ہوئے دریافت کیا۔ ابھی تک عالیہ کی آواز معمول پر نہیں آئی تھی ـــــــــ،

"کھانا ہی نکالو" ـــــــــ اُس نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے غور سے عالیہ کو دیکھا۔

عالیہ کھانا نکالنے لگی ـــــــــ "آج بھی آپ دفتر نہیں گئے۔ بے کار چھُٹّی ضائع ہو رہی ہے۔"

"کل سے جانے کی کوشش کروں گا مگر ......" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہوگیا اور اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اُسے خود بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیا کہنا چاہئے ـــــــــ،

کامران کھانا کھا کر باہر نکل گیا اور عالیہ گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ دن ڈھلا اور سہ پہر میں بچّے آگئے، اور حسبِ معمول ماں کو تنگ کرنے لگے۔

"میں یہ نہیں کھاؤں گی۔ آپ نے کدّو کی سبزی کیوں نہیں بنائی؟"

"کدّو؟ چھی! ممّی کل مٹر اور پنیر بنایئے گا۔"

"مٹر اور پنیر تو یہی کھائیں گے۔ میرے سامنے آیا تو میں اُسی میں پانی ڈال دوں گی۔"

عالیہ اپنا سارا غم بھول کر بچّوں میں لگ گئی اور جب بچے کھیلنے چلے گئے، تو وہ جُوٹھے برتنوں کو اس طرح صاف کرنے لگی جیسے اس میں بھی اُسے

لذّت مل رہی ہو!

وقت گذرتا چلا گیا اور احساس کی تپش بتدریج منجمد ہوتی چلی گئی۔ ایک کمرہ کے مکان میں زندگی بسر کرنا خود ہی کم سوہانِ روح نہیں کہ ساتھ میں اس غم کے احساس کا بوجھ بھی آدمی اُٹھائے چلے؟

ڈبلو اور پنکی اپنے بڈ پر سو رہے ہیں، کامران پلنگ پر جماہی پر جماہی لے رہا ہے اور عالیہ فرش پر کروٹ بدل رہی ہے کہ کامران کے خرّاٹوں کی آواز آئے تو وہ بھی نیند کو اپنے پاس بلائے ——— ہلکا بلو نائٹ بلب بھی آج سو رہا ہے۔ لگتا ہے عالیہ آن کرنا بھول گئی ہے ———

کامران سونے کی بار بار کوشش کر رہا ہے لیکن عالیہ کی چمکیلی سیاہ نائٹی اس کے ذہن سے چپک سی گئی ہے اور لاکھ جھٹکنے کے باوجود وہ اس کی پلکوں سے مَس ہونے لگتی ہے اور عجیب قسم کی ٹھنڈک کا احساس کامران کو سرور بخشنے لگتا ہے۔ وہ کروٹ لے کر سینہ کے بل ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ فرش کو چھونے لگتے ہیں۔ ایک ہلکی سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کے ایک کونے پر اُبھرتی ہے اور قدم جمائے رہتی ہے۔ بے خیالی میں کامران کا ہاتھ کچھ اور آگے بڑھ کر عالیہ کے بازو سے مَس کر جاتا ہے۔ عالیہ دھیرے دھیرے کروٹ لیتی ہے اور گھپ اندھیرے کے باوجود اُس کے ہونٹ کامران کی انگلیوں سے جا لگتے ہیں۔

جیسے کہ ——— جیسے کہ اُسے دیر سے اس کا انتظار تھا ———!!!

سوچ کا کرب

میری ماں بیمار ہے اور میں پریشان ہوں ——— '

عجیب بات ہے ؟

مجھے اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیئے ۔ پریشان تو ابا کو ہونا تھا لیکن ابا کو کوئی خاص فکر نہیں تھی البتہ میری پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا ——— ویسے بھی جب کبھی ماں بیمار پڑتی میرے ذہن میں بس ایک ہی سوال ابھرتا، اب کیا ہوگا ؟ ——— لیکن اِس "اب کیا ہوگا" کا جواب میرے پاس نہ تھا ۔ میں دور خلاؤں میں اس کا جواب تلاش کرنے کی ناکام کوششیں بھی کرتا لیکن مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا ۔ شاید یہی میرا مقدّر تھا !

ماں بیمار ہے اور میں پریشان ہوں ——— '

جتنا میں پریشان ہوں شاید ہی گھر کا کوئی فرد اتنا پریشان ہو لیکن

سب کے چہرے پر ایک سپاٹ سی مایوسی اور خاموشی ضرور تھی۔ گھر میں والدین کے علاوہ چھ بہنیں اور چار بھائی ہیں۔ بڑے بھائی شمیم اصغر ۳۰ سال کے ہیں۔ ان کے بعد میں ہوں اور پھر چھ بہنیں اور دو بھائی! ۔ دو بہنیں شادی کے لائق ہیں جن کی شادی ابّا کو کر دینی چاہیئے تھی ـــــ ان کے علاوہ بھائی جان کی بھی شادی ہو جانی چاہیئے تھی لیکن اوّل تو بھائی جان کی کوئی اچھی سی نوکری نہ تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ بہو کو رکھنے کے لئے ابّا کے پاس کمرہ بھی نہ تھا ـــــ ہمارا اتنا بڑا کنبہ صرف تین کمروں میں گزارہ کرتا ہے۔ ایک کمرہ میں مَیں، بھائی جان اور ابّا، باقی دو کمروں میں گھر کے دیگر افراد کسی طرح گزر بسر کر لیتے ہیں۔ وہ بھی کرائے کا مکان! ـــــ کرائے کے مکان میں تو اچھے اچھے لوگ رہتے ہیں۔ اِس سے کیا ہوتا ہے ـــــ کیا دوسرا مکان کرائے پر نہیں مل سکتا؟ لیکن ابّا کی اتنی آمدنی ہی نہیں کہ زیادہ کمروں والا مکان کرایہ پر لے سکیں۔ وہ ایک دفتر میں چپراسی ہیں، صرف دو ہزار روپئے کے ملازم! وہ تو خدا کی مہربانی کہیئے کہ آمدنی کے کچھ ذرائع ہیں۔ ورنہ ایک وقت بھوکا ہی رہنا پڑتا۔ ویسے بھی جو حالت ہم لوگوں کی ہے وہ ایک وقت بھوکا رہنے کے برابر ہی ہے۔

ہاں تو دو بہنیں شادی کے لائق ہیں اور بھائی جان کی بھی شادی ہو جانی چاہیئے تھی لیکن بھائی جان ـــــ وہ ایک پرائیوٹ فرم میں محض ایک ہزار روپئے کے ملازم ہیں۔ انھوں نے زیادہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جب بھائی جان کا زمانہ پڑھنے کا تھا، اس وقت تک ابّا کو نوکری ہی نہیں ملی تھی۔ کسی طرح

کھینچ تان کر ساتویں جماعت تک پڑھ سکے۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کام کرتے رہے اور پھر ایک پرائیوٹ فرم میں ملازم ہو گئے ——— میرے وقت میں ابا کو نوکری مل گئی تھی۔ چنانچہ میں نے کسی طرح میٹرک پاس کر لیا۔ اس کے بعد مجھے خود پڑھنے کا شوق ہوا اور ٹیوشن کر کے بی۔ اے تک پہنچ گیا۔ بہنوں میں دو نے سرکاری اسکول سے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ لیکن اب آگے پڑھانے کے لئے ابا کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس لئے اب وہ گھر کے کام کاج ہی میں مشغول رہتی تھیں۔ باقی چھوٹے بھائی بہن بالترتیب ہائی اور مڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔

ماں بیمار ہے اور میں پریشان ہوں ——— '

پریشانی کی وجہ ہے ....

کل جب میں باتھ روم میں غسل کر رہا تھا، ماں پڑوس کی چاچی سے کہہ رہی تھی۔ " کیا کہوں، آج تین دن سے بیمار ہوں لیکن اسی حال میں گھر کے کام بھی کرنے پڑ رہے ہیں۔ "

" تو ڈاکٹر کو دکھا کر دوا کیوں نہیں لے لیتی! " ——— چاچی بولی۔

" ارے کیا دکھاؤں، ایک بار کا رہے تب تو۔ ٹھیک سے سال بھی پورا نہیں ہوتا کہ دوسرا سانس لینے لگتا ہے۔ "

" پھر آپریشن کیوں نہیں کروا لیتی۔؟ "

" آپریشن! اوئی اللہ، کیا کہہ رہی ہو۔ یہ تو کفر ہے۔ اور پھر یہ تو اللہ کی رحمت ہے .... اُس سے پوچھو، جس کے پاس ایک بھی اولاد نہیں۔ اور وہ اولاد کے لئے ترستا رہتا ہے، بچّے کی کلکاریوں سے اس کے کان نا آشنا ہوتے ہیں وہ رات دن مزاروں اور درگاہوں پر اپنا خالی دامن پسارے پھرتا ہے .... پھر جب مجھے خدا دے رہا ہے تو لینے سے انکار کیوں؟! "

" تُو پاگل ہے۔ اپنے گھر کا حال دیکھ۔ صرف بچّہ پیدا کرنا ہی کافی نہیں۔ اُس کی تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے۔ نہیں تو روزِ محشر ان بچّوں کے ہاتھ ہوں گے اور تمہارا اور تمہارے شوہر کا دامن! ـــــــــ اولاد واقعی خدا کی رحمت ہے۔ لیکن خدا یہ بھی کہتا ہے کہ تم اپنے بچّوں کو اس لائق بنادو کہ وہ دین اور دُنیا میں سُرخرو رہیں ـــــــــ بھلا سوچو تو ذرا، تم نے اپنے بچّوں کے لئے کیا کیا ہے؟؟ ابھی تک نہ بیٹی کی شادی کر سکی ہو اور نہ ہی بیٹے کی...."

" رہنے دو بہن، خدا کی مصلحت ہوگی تو سب ہو جائے گا۔ جب اس نے دیا ہے تو اس کا انتظام بھی وہی کرے گا۔ مجھے فِکر کرنے کی کیا ضرورت!....."

ـــــــــ صابن کا جھاگ میری آنکھوں میں چلا گیا، جس سے کڑواہٹ کا احساس ہوا اور میں نے فوراً اپنی آنکھوں پر پانی ڈالا کہ کڑواہٹ کم ہو لیکن ابھی تک میری آنکھوں میں کڑواہٹ موجود ہے، میری زندگی کی طرح ـــ

ماں آپریشن کے لئے تیار نہیں اور ابّا اس کے بارے میں آج تک سنجیدہ نہیں۔ وہ بھی ماں کے ہم خیال ہیں۔ میں آپریشن کے لئے نہ ماں کو کہہ سکتا ہوں اور نہ ابّا کو ـــــــــ صرف سوچ سکتا ہوں۔ لیکن سوچ اور محض سوچ تو کسی مسئلے کا حل نہیں۔ جب تک اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے ـــــــــ میری زندگی ان دو شخصیتوں کے بیچ عجیب مخمصے میں ہے۔ کیوں کہ اب دوستوں میں بھی .... ہاں آج شام ہی کی بات ہے۔ جب میں امیت کے گھر اُس سے ملنے گیا تھا تو وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا سلیم سے کہہ رہا تھا ـــــــــ

" یار! عابد کے ممّی ڈیڈی بھی عجیب ہیں۔ بچّوں کا ڈھیر لگائے جا رہے ہیں لیکن آج تک ان کے مستقبل کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ شمیم بھیّا کو

دیکھونا !۔ اگر ان کی شادی ہوجاتی تو آج وہ دو بچّے کے باپ ہوتے۔ عذرا کے بھی بچّے ہو جاتے اور نکہت بھی ماں بن گئی ہوتی۔ تم نے تبسّم کو دیکھا؟ اب وہ بھی جوان ہوتی جا رہی ہے۔ کس طرح شادی کریں گے اُس کے ڈیڈی .....؟.....؟... اور اس کے آگے مجھ میں سُننے کی ہمّت ہی نہیں تھی۔ میں ان سے بغیر ملے ہی چلا آیا ______

امیت کی کہی ہوئی ساری باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ میں آج تک کسی بھی دوست کو اپنے یہاں ڈھنگ سے بیٹھا نہیں پایا تھا۔ کیوں کہ میرا علیحدہ کوئی کمرہ نہیں ہے۔ بس سب کھڑے کھڑے ہی مِل کر چلے جاتے ہیں۔ وہی حال بھائی جان کے دوستوں کا ہے اور وہی طرزِ عمل آبّا کے ملنے والوں کا! ______

ہاں تو ماں بیمار ہے اور میں پریشان ہوں ______'

پریشان ہونا ہی اس مسئلے کا حل نہیں۔ لیکن میں سوچنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میں لمحہ بھر کے لئے بھول گیا تھا کہ سوچنے والا انسان تو وہیں پہ کھڑا رہتا ہے جہاں وہ کھڑا سوچ رہا ہوتا ہے اور وقت دور بہت دُور نکل جاتا ہے واقعی جب میں اپنے آپ میں آیا تو معلوم ہوا کہ وقت اپنا بہت طویل سفر طے کر چکا ہے ______

آج ماں کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور آبّا گھر پر نہیں ہیں۔ بھائی جان بھی آفس جا چکے ہیں۔ جب میں نے ماں کی طبیعت بہت زیادہ بگڑتی دیکھی تو محلّے کے ایک ڈاکٹر کو بُلا لیا۔ انہوں نے چیک اپ کیا اور کہا ______

"آپ فوراً انہیں ہسپتال لے جائیے۔"

"کیا؟ !______" میں گھبرا گیا لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ اب تو کچھ کرنا ہی تھا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں اور میری جیب بھی خالی ہے ___

پھر ماں .... میں نے سائیکل اُٹھائی۔ بھاگم بھاگ ابّا کے آفس پہنچا، اور انھیں حالات سے آگاہ کیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے گھبرا گئے لیکن فوراً سنبھلتے ہوئے بولے ــــــ دیکھو، روپیہ تو اس وقت میرے پاس بھی نہیں ہے۔ ابھی مہینے کی بیس تاریخ ہی ہے۔ ایسا کرو عذرا سے ماں کا جو ایک زیور بچا ہوا ہے مانگ لینا اور اسے رہن رکھ کر ماں کو ہسپتال میں بھرتی کرا دینا۔ میں ابھی چھٹی لے کر آتا ہوں۔ "

میں گھر کی طرف چل پڑا، اپنے ذہن میں ایک تناؤ لئے ہوئے۔ ابّا نے کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ ماں کا زیور رہن رکھ دینا ــــــ یہ ماں کا آخری زیور ہے جسے رہن رکھنے کا حکم مجھے دیا گیا تھا۔ ماں کے سارے زیورات اسی طرح ساہوکاروں کی توندوں کی نذر ہوئے تھے۔

سڑک پر سائیکل کے رینگتے ہوئے پہیّوں کے ساتھ میرے ذہن میں یہ بات رینگ رہی ہے ــــــ کاش! ماں آپریشن کرا لیتی تو آج گھر کے اس آخری زیور کو رہن رکھنے کی نوبت نہ آتی۔

پھر میرے من کے سمندر سے ایک سوال اُبھرا ــــــ ہسپتال تو ماں کو لے جانا ہی ہے۔ اُسی کے ساتھ اس کا آپریشن بھی کیوں نہ کرا دوں۔ دستخط وغیرہ کی بات آئی تو ڈاکٹر کو سمجھا کر ابّا سے دستخط کرا لوں گا۔ وہ اتنا تھوڑے ہی دیکھیں گے کم پڑھے لکھے تو ہیں۔ اور یہ خیال آتے ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خوشی کے مارے انگ انگ تھرکنے لگا اور خود بخود سائیکل کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب میں بہت خوش ہوں اور خوشی سے جھومتا ہوا گھر پہنچا ــــــ لیکن جیسے ہی گھر میں داخل ہوا کسی نوزائیدہ بچّے کے رونے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں ــــــ!

●●

روشنی بُلاتی ہے

پہلی بار جب عارف نے تنویر کے یہاں پارٹی میں اُسے دیکھا تو اُسے یوں لگا کہ کہکشاں کو وہ بہت پہلے سے جانتا ہو۔ بار بار اُس کی نگاہیں کہکشاں کی طرف اُٹھ جاتیں مگر وہ اُس کے جذبات سے بے نیاز اپنی سہیلیوں سے محو گفتگو تھی۔ عارف بے ساختہ چپکے سے اُس کے قریب جا کھڑا ہوا اور سرگوشی کے انداز میں کہا ——— "آپ" ....

"جی ....؟" اُس نے عارف کی طرف گھوم کر دیکھا

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا ———؟"

"جی ہاں ...... جی نہیں ...." عارف گھبرا گیا۔ اُس کے اس انداز پر کہکشاں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی ———

"کہئے نا ..... کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"بس یوں ہی ......" عارف سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا گفتگو کرے۔

"مجھے کہکشاں کہتے ہیں" ——— کہکشاں نے ہی بات آگے بڑھائی ——— "اور غالباً آپ عارف احمد ہیں، تنویر بھیا کے دوست!" ———

"ارے! آپ مجھے جانتی ہیں ......" عارف حیرت زدہ رہ گیا۔

"میں نے آپ کو پہلی بار کالج میں دیکھا تھا کسی فنکشن میں، کیا زوردار تقریر کی تھی آپ نے۔ میں تو اُسی وقت سے آپ کی فین ہوں۔"

کہکشاں اتنی جلد کھل جائے گی۔ یہ عارف کی سوچ سے باہر تھا۔ بہر حال اُسے واقعی خوشی ہوئی اور فخر بھی کہ کوئی خوب صورت لڑکی اُس کی فین بھی ہو سکتی ہے ———

پھر عارف اور کہکشاں کی ملاقاتیں بڑھتی چلی گئیں۔ اکثر شامیں دونوں کی ساتھ گذرنے لگیں۔ ایسی ہی ایک خوب صورت شام میں عارف نے اپنا دل نکال کر کہکشاں کے قدموں میں رکھ دیا ———

"کہکشاں میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

کہکشاں کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اُس کی نگاہیں جھک گئیں اور لب خاموش۔ کہکشاں کی خاموشی سے عارف کو اطمینان ہو گیا۔ کہکشاں کے دل میں بھی اُس کے لئے پیار ہے تبھی تو وہ خاموش رہی۔ ورنہ انکار کر دیتی۔ عارف نے جھوم کر سگریٹ نکالا اور ابھی سُلگا کر پہلا ہی کش لیا تھا کہ کہکشاں کی آواز آئی ———

"مجھے سگریٹ پینے والے لوگ پسند نہیں!" ——— عارف سٹپٹا گیا لیکن اُس نے سگریٹ فوراً زمین پر پھینک کر اُسے جوتے سے مسل دیا۔

"آپ میری بات اتنی جلد مان لیں گے مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔

" کہکشاں میں نے تم سے پیار کیا ہے ۔ اس لئے تمہاری پسند اور ناپسند کا خیال تو ہر حال میں رکھنا پڑے گا" ـــــــ عارف جذباتی ہو گیا ۔

" آپ مجھے اتنا چاہتے ہیں ؟ "

" یقین نہیں آتا ـــــــ ؟ "

" اب آ گیا ۔ "

" عارف کا دل مسرت سے لبریز تھا کہ کہکشاں بھی اُسے چاہتی ہے ۔ اب وہ ہر لمحہ اُس کے خیالوں میں مزید گُم رہنے لگا اور پھر یوں ہوا کہ ایک شام کہکشاں عارف کی دہلیز تک پہنچ گئی ۔ عارف کہکشاں کو دیکھ کر باغ باغ ہو اُٹھا ۔ اُس نے کہکشاں کو اپنے گھر والوں سے مِلوایا اور پھر دونوں بہت دیر تک مستقبل کے تانے بانے بُنتے رہے ـــــــ '

اچانک ایک پیکیٹ کہکشاں نے اپنے بیگ سے نکال کر عارف کے سامنے رکھ دیا ۔

" یہ کیا ہے ؟ " ـــــــ عارف نے سوالیہ نگاہوں سے کہکشاں کی طرف دیکھا ۔

" میری طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ ' جنم دن مبارک ہو ۔ "

" میرا جنم دن ؟ اوہ ! " .... عارف حیرت زدہ رہ گیا ۔

" جناب ذرا کلنڈر کی طرف نگاہ کیجئے " ـــــــ عارف کو یاد آیا ۔ آج تیئس نومبر ہے ۔ واقعی اُس کا جنم دن تھا ۔

" میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا" ـــــــ عارف جھینپ سا گیا ۔

" ہاں اب تو جنم دن بھی یاد دلانا پڑے گا ؟ " ـــــــ

" کیا کروں تمہارے پیار میں سب بھول گیا ہوں" ـــــــ

عارف نے بات بدلی ۔

کہکشاں ہنس دی ۔ پھر ایک چھوٹا سا پیکیٹ مزید نکالا اور اُسے کھول کر ایک مٹھائی عارف کے مُنہ میں ڈال دی ۔ عارف نے بھی پیکیٹ کی دوسری مٹھائی اُس کے مُنہ میں ڈال دی ۔

" کہکشاں ایک خوف میرے دل میں کانٹے کی طرح چُبھ رہا ہے ۔ "

" کیا ؟ " ـــــــ

" تم میرا ساتھ چھوڑ تو نہیں دو گی ؟ " ـــــــ عارف کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آنے لگا ۔

" ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ ـــــــ ؟ کہکشاں کچھ نروس ہو گئی ۔

" اس لئے کہ لڑکیاں دولت ، شہرت اور چمک دمک کی طرف فوراً مائل ہو جاتی ہیں ۔ "

" اور مرد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ "

" مرد بے چارہ بے وفائی کر کے کہاں جائے گا ؟ "

" تو آپ نے مجھے بے وفا سمجھ رکھا ہے ، خوب ؟ "

" ارے نہیں...... نہیں ! تمہیں بے وفا سمجھتا تو اپنا ہم سفر منتخب کرتا ؟ "

" شکریہ ...... شکریہ ، بہر حال آپ کو میں یقین دلاتی ہوں کہ آپکے انتخاب کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا ـــــــ "

" مجھے تم سے ایسی ہی اُمید ہے " ـــــــ عارف کھِل اُٹھا ۔

وقت کا نہ رُکنے والا قدم آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کہکشاں کی پڑھائی بھی ختم ہو گئی لیکن نوکری کے لئے عارف کی دوڑ دھوپ ختم نہیں ہوئی۔ وہ کہکشاں کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اور اُسے کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی بے کاری ...... خوابوں کو چور کرنے پر تلی ہوئی تھی ــــــــــ

کہکشاں کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے عارف ذرا دیر کے لئے اونگھ گیا تھا یا کہکشاں کے تصور میں کہیں کھو گیا تھا ــــــــــ تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں آئی اور عارف کے سامنے بیٹھ کر چائے بنانے لگی ــــــــــ

" کل آپ کی کہانی ریڈیو پر سُن رہی تھی۔ اچھی کہانی تھی لیکن کلائمکس پسند نہیں آیا۔ ہیرو کو خودکشی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اگر ہیروئن نے دوسرے سے شادی کر لی تو اُسے بھی کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لینی چاہئے تھی۔"

عارف خاموش رہا۔ اُس کا ذہن تو کہیں اور بھٹک رہا تھا ــــــــــ اگر جلد ہی نوکری نہیں ملی تو ؟

" کیا بات ہے ؟ بالکل خاموش بیٹھے ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

" آں ؟ ......" عارف چونکا ...... کوئی خاص بات نہیں ہے کچھ پریشانی تو ضرور ہے۔"

" پریشانی کا سبب ؟ "

" میری بے روزگاری !" ــــــــــ عارف کی آواز ڈوب

رہی تھی۔

"آج نہیں تو کل نوکری ضرور ملے گی۔ آپ بے کار پریشان ہیں۔"
کہکشاں نے ڈھارس بندھائی۔

"لیکن میں تمہاری ممّی کو کب تک بہلاتا رہوں گا؟ کہیں انہوں نے مایوس ہوکر ......" عارف نے سوالیہ نگاہیں کہکشاں پر ڈالیں ــــ
ــــــ کہکشاں نے سر جھکالیا۔

"کہکشاں! تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب دوں۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا!"
کہکشاں کی آواز بھی توانائی کھو رہی تھی۔ اسی درمیان ممّی نے اندر سے آواز دی اور وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی ــــــ

کہکشاں نہ صرف ایک خوش حال گھرانہ کی لڑکی تھی بلکہ پڑھی لکھی بھی تھی، خوب صورت بھی تھی اور سلیقہ مند بھی۔ آئے دن اس کے رشتے آتے رہتے تھے۔

آج بھی صبح سے اُس کے گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ کچھ لوگ کہکشاں کو دیکھنے آئے تھے مگر کہکشاں کا دل آج کچھ زیادہ دھڑک رہا تھا۔ وہ بہت بے چین سی گھر میں پھرتی رہی۔ اُسے نتیجہ کا انتظار تھا۔ کئی مرتبہ محض ناقابل برداشت "مانگ" کی وجہ سے رشتہ طے ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ آج دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لڑکے والوں نے کہکشاں کو محض دیکھا اور پسند کرلیا۔ اُس کی چھوٹی بہن اِترا اِترا کر اُسے تفصیل بتانے لگی۔

" آپی ! یہ دیکھو فوٹو، کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے تمہارا ہیرو، سرکاری ٹیچر ہے۔ اپنا گھر ہے، اپنی گاڑی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی ڈیمانڈ نہیں۔ بات پکی۔ تم واقعی لکی ہو آپی۔ "

کمرہ میں لیٹے لیٹے کہکشاں نے پھر بے چینی محسوس کی۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے آنگن میں ہر طرف کائی پھیلی ہوئی ہے اور وہ قدم رکھتے ہی پھسلی جا رہی ہے۔ دور بہت دور تک! ——— دوسری طرف اُس کا تصور ایک اور آنگن دیکھتا ہے جس میں ہر طرف رنگینیاں ہی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ روشنی ہی روشنی جو اُسے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے قدم آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں ——— اچانک ایک آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی ہے ——— "کہکشاں! تم کدھر جا رہی ہو؟" وہ چونک کر پیچھے دیکھتی ہے۔ ایک شناسا چہرہ تاریکی میں اپنی شبیہہ اُبھارتا دکھائی دیتا ہے ——— کہاں جا رہی ہو کہکشاں مجھے چھوڑ کر؟" ——— وہ آواز کہکشاں کو ٹوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ گھوم کر اُبھرتی ڈوبتی شبیہہ پر نظر جمانے کی کوشش کرتی ہے کہ ایک دوسرا فلیش چمکتا ہے ——— وہ ٹھٹھک جاتی ہے ——— گھبرا کر سامنے والے آنگن میں دیکھتی ہے، جہاں مختلف قسم کی روشنی مل کر خوش آمدید کہہ رہی تھیں ——— اور پس منظر میں موسیقی دل کی دھڑکنوں کو چھیڑ رہی تھی ——— وہ

لمحہ بھر کے لئے گویا کھڑی سوچنے لگتی ہے ــــــــــ ایک طرف تاریکی ہے ــــــ پھسلن ہے ــــــ غیر یقینی صورت حال ہے ــــــ اور دوسری طرف ــــــــــ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھتی ہے اور اپنی چھوٹی بہن کو گلے لگا لیتی ہے ــــ!

سایہ

کمرہ میں داخل ہوئی تو رنجنا کی آنکھوں سے تھکن کا احساس پوری طرح نمایاں تھا۔ باہر کی سخت دھوپ اور لو کے مقابلے میں کمرہ میں ٹھنڈک پھیلی تھی۔ اُس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اور کمرہ کا جائزہ لینے لگی۔ نوکرانی اُس کا سامان ایک طرف رکھ کر جا چکی تھی۔ جنوب کی دیوار سے لگا ایک پلنگ تھا جس پر سفید بیڈ شِٹ پھیلی ہوئی تھی، دیوار کا رنگ بھی سفید تھا۔ صوفوں پر جو غلاف چڑھے تھے وہ بھی سفید تھے۔ دروازے کے پردے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ باہر سے دھوپ کی روشنی کمرہ کا اندھیرا دور کر رہی تھی۔ سامنے کی دیوار پر آویزاں تصویریں مکینوں کے شائستہ مزاج کی غماز تھیں۔ میز پر ایک چھوٹا سا فریم رکھا تھا جس میں کامنی اور منوہر کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ میز سے ذرا ہٹ کر کولر کمرہ کو ٹھنڈک بخش رہا تھا۔ کولر کے اوپر دیوار پر ایک کلینڈر میں ایک بچہ مسکرا رہا تھا ——— بچہ؟ ——— رنجنا کو یاد آیا کہ اُس کا مُنا اُس کے کاندھے پر ہی سو رہا ہے۔ اُس نے بچے کو اُتار کر گود میں

لے لیا، بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس نے اسے پلنگ پر لٹا دیا اور خود صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹیبل پر کئی رسالے اور تازہ اخبارات موجود تھے، اُس نے ایک رسالہ اٹھا لیا۔

کامنی ابھی تک نہیں آئی تھی ———

یہ کامنی کا گھر تھا جہاں وہ اپنے پتی منوہر کے ساتھ سکون و آرام سے رہ رہی تھی۔ وہ اُس کے بچپن کی دوست تھی اور اُس کی موجودہ پریشانیوں سے باخبر، اُس کی ضد کے آگے رنجنا نے ہتھیار ڈال دیئے اور آج اُس کے ساتھ رہنے کے لیے چلی آئی تھی۔ وہ یہاں رہے گی تو اُس کا بھی دل لگے گا اور رنجنا کو ایک من پسند کمپنی مل جائے گی۔

کامنی کمرہ میں داخل ہوئی اور رنجنا کو بیٹھی دیکھ کر کھل اُٹھی۔

"ہائے رنجنا! مائی لو، تم کب آئی؟"

"بس تھوڑی دیر پہلے" ——— رنجنا بھی مسکرا اُٹھی جیسے اچانک سارا تکدّر دور ہو گیا ہو۔

"سوری ڈیر، آفس میں دیر ہو گئی۔ ایک نیا ایڈ (اشتہار) کمپنی کو دینا تھا، اسکرپٹ فائنل کر رہی تھی۔"

کامنی ایک ایڈ کمپنی چلا رہی تھی، اُس کے بنائے ہوئے اشتہار ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بے حد مقبول تھے۔ اُس کا شوہر اے آئی آر میں پروگرام اگزکیٹو تھا۔

کامنی نے شانتی کو آواز دے کر کھانا میز پر لگانے کو کہا۔

"رنجنا تمہیں یہاں آنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟............ اوہ! اسے تو میں نے دیکھا ہی نہیں، شریر اِدھر سو رہا ہے۔" ——— کامنی بچے کی طرف بڑھی اور اُسے تھپتھپایا، پھر نوکرانی سے بولی ——— "دیکھو اوپر کا داہنی طرف کا کمرہ ٹھیک کر دو۔ آج سے رنجنا یہیں رہے گی، کسی شکایت کا موقع نہ دینا۔"

"جی مالکن!"

"رنجنا اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ یہاں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے ——— اور ہاں اگر تم میرے ساتھ میری کمپنی میں کام کرنا چاہو تو ساتھ ہو جاؤ۔ نہیں تو کوئی دوسرا جوب ڈھونڈ دوں گی یا تم اپنا پرانا شوق ڈانس پھر سے شروع کر سکتی ہو۔"

"جس شوق نے میرا سب کچھ چھین لیا اب میں اُسے نہیں اپنا سکتی، لیکن زندہ رہنے کے لیے مشغول بھی ہونا پڑتا ہے۔ تم جیسا مشورہ دو گی، ویسا ہی کروں گی۔"

"مالکن کمرہ تیار ہے۔" ——— شانتی نے خبر دی۔

"رنجنا! تم ذرا جلدی سے فریش ہو لو، ہم لوگ ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں دس منٹ بعد ڈرائنگ ہال میں تمہارا انتظار کروں گی، بقیہ باتیں کھانے کی میز پر، اوکے۔"

کامنی اپنے کمرہ کی طرف بڑھ گئی اور رنجنا زینہ طے کرنے لگی۔ شانتی اُس کے پیچھے اس کا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے تھی ———،

——— کیا مرد کے بغیر عورت نہیں جی سکتی؟ ——— وہ اکثر سوچتی ——— اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو زندگی کے تین سال کس قدر خاموشی سے گزر گئے تھے۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر یادیں ہمیشہ اُس کا پیچھا کرتیں ——— وہ یہاں آکر ایک نئے عزم کے ساتھ زندگی کا اگلا سفر شروع کرنا چاہتی تھی، پر آنکھوں کے آگے یادوں کا میلہ سا لگا رہتا۔ چلتے پھرتے موسموں کی رنگ برنگی دھجیاں، شور شرابے، خوشیاں اور خوشبوؤں کے درمیان جہاں کل وہ گھری رہتی تھی۔ یکایک تنہائی اُس کی زندگی کا ایک حصہ بن

گئی تھی۔

کل اور آج میں کتنا فرق تھا ــــــــ،

کل کی زندگی کتنی تلاطم بھری تھی اور آج اُس کی زندگی ــــــــ؟ وہ سوچتی ــــــــ کل انسان زندگی جیتا تھا اور آج زندگی انسان کو قطرہ قطرہ جی رہی ہے۔ آج ہر طرف زندگی میں ایک میلہ سا لگا ہوا ہے۔ کھیل تماشے اور رنگینیاں بکھری پڑی ہیں۔ ہر انسان اپنا کھیل دِکھاتا ہے اور پھر میلہ ختم ہو جاتا ہے۔

اُس نے سوچا ــــــــ،

اس کے اور ساگر کے درمیان کیسا رشتہ تھا؟ ــــــــ شوہر بیوی کا رشتہ تھا یا محض فریب؟......؟......؟ وہ بہت دیر تک اپنے آپ سے پوچھتی رہی اور جواب نہ پاکر مزید اُلجھتی رہی ــــــــ

ایک رات ساگر کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔ چاول کا پہلا نوالہ لیتے ہی اُس نے بیسن میں جاکر اُگل دیا اور چیخ کر بولا ــــــــ

"اب کنکر بھی نکالنے کا وقت نہیں ہے؟"

"کنکر ــــــــ؟" وہ حیران ہو اُٹھی۔ "کنکر کہاں سے آگیا، تین مرتبہ تو چاول کو دھویا ہے۔" ــــــــ اُس نے صفائی پیش کی مگر ساگر نے تو جیسے کچھ سنا بھی نہیں۔

"ناچ گانے سے فرصت ملے تب تو۔ آج کا اخبار دیکھا ہے؟ کس پوز میں تمہاری تصویر چھپی ہے۔ دفتر میں لوگ مزے لے لے کر تصویریں دیکھ رہے تھے۔ میں نے تمہیں کئی بار منع کیا ہے کہ مجھے ناچنا گانا قطعی پسند نہیں، جب تک تم اپنے ماں باپ کے گھر تھیں جو چاہا کیا لیکن یہاں میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

ــــــــ اور پھر ساگر بات بات پر سلگنے لگا۔ رنجنا سارا دن بے چین سی گھر

آنگن میں پھرتی رہتی۔ اُس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک جاتا ــــــ ساگر پہلے ایسا نہیں تھا، کتنا چاہتا تھا اُسے۔ اُس کے پریم میں دیوانہ تھا لیکن اچانک اُس میں بدلاؤ آگیا۔ اُس کی بڑھتی مقبولیت اور اخبار و رسائل میں چھپنے والی تصویروں نے اُسے شک کے حصار میں لے لیا۔ اُس کا اپنا وجود بونا نظر آنے لگا تھا اور وہ رفتہ رفتہ اُس سے دور ہوتا چلا گیا اور ایک دن اُس نے سارے رشتے منقطع کر لیے ــــــ!

"رنجنا آفس نہیں چلنا ہے؟" ــــــ کامنی اُس کے کمرہ میں داخل ہو کر اُس کے خیالات کے سلسلہ کو توڑ دیتی ہے۔

"اوہ، ہاں! چل رہی ہوں۔" ــــــ وہ اپنے کو سنبھالتی ہوئی اٹھتی ہے اور وارڈ ڈروب سے ساڑی نکالنے لگتی ہے ــــــ "تم چلو میں ابھی آئی۔"

رنجنا نے دھیرے دھیرے خود کو بیحد مصروف کر لیا تھا کہ ساگر کی یادوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکے اور اس میں اب بہت حد تک اُسے کامیابی مل بھی رہی تھی، اُس کی تنہائیاں منوہر اور کامنی نے مل کر بانٹ لی تھیں اور پھر اس کا اپنا بچہ بھی تو تھا اُس کی محبت کی نشانی، اُس کی زندگی کا سرمایہ.........

"رنجنا! کامنی کا فون آیا ہے، تم اُس کے آفس چلی جاؤ۔ تمہارے ساتھ وہ کہیں جانا چاہتی ہے۔" ــــــ منوہر نے رنجنا کا میسج دیا۔

"ٹھیک ہے، ابھی جاتی ہوں۔"

کامنی ایک ہفتہ سے آوٹ ڈور سائٹ سٹنگ پر گئی ہوئی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں رنجنا ہی آفس کی ذمہ داری نباہتی ہے۔ وہ آفس میں کسی فائل میں الجھی تھی کہ انٹرکوم پر ریسپشنسٹ اطلاع دیتی ہے کہ ملہوترا کمپنی کے منیجر اپنے ایڈ کے سلسلہ میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ ملہوترا کمپنی کی فائل شیلف سے نکالتی ہوئی

ہدایت دیتی ہے کہ انہیں دو منٹ بعد بھیج دیا جائے۔ چند منٹ بعد ساگر اُس کے سامنے کھڑا حیرت سے اُسے دیکھے جارہا تھا۔ رنجنا کی اُٹھی ہوئی نگاہ ساگر میں اٹک کر رہ گئی۔ اُس کے سارے اعضا ساکت ہو کر رہ گئے۔ اچانک اُس کا دل بڑے زور سے دھڑکا اور اچھل کر جیسے حلق میں آکر پھڑ پھڑانے لگا۔ اُس کی زبان بالکل خشک ہو گئی اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور پھر اس کا سر کرسی سے جالگا —— ساگر یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلا ——

"کیا ہوا رنجنا؟"

رنجنا جواب نہیں دے پائی۔ وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تھی تو پیاس کی شدت نے اُس کی زبان گویا بند کر دی۔ ساگر ٹیبل پر رکھا گلاس اٹھا کر اُس کے منہ تک لے جاتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ سے گلاس پکڑ کر غٹ غٹ پانی پینے لگتی ہے مگر دو گھونٹ کے بعد ہی گلاس اُس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے —— جب اُسے ہوش آتا ہے تو وہ خود کو اپنے کمرہ میں پاتی ہے۔ پاس ہی منوہر اور کامنی بیٹھے اُسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے ——،

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" —— کامنی نے اُسے ہوش میں آتے دیکھ کر دریافت کیا۔

"تم...... مجھے ...... کیا ہو گیا تھا؟" —— رنجنا نحیف آواز میں دریافت کرتی ہے۔

"تم اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں؟" —— منوہر نے مرض کے بارے میں اُسے بتایا اور ساتھ ساتھ سوال بھی کیا —— "کیا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے؟"

”نہیں کبھی نہیں، دراصل“............ رنجنا اچانک رُک گئی، اُسے ساگر یاد آگیا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تم ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ ——— کامنی نے تسلی دی۔

”کامنی وہ“............ رنجنا کچھ کہنا چاہتی تھی۔

”میں سمجھ گئی۔ تم ساگر کے بارے میں کہنا چاہتی ہو، میں نہیں جانتی تھی کہ وہ ملہوترا کمپنی کا منیجر ہے۔ اس کمپنی کے لیے میں نے کئی ایڈ بنائے ہیں لیکن ساگر اس سلسلہ میں پہلی بار آیا تھا۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔“

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ میرے سامنے نہ آئے۔“

”اب ایسا ہی ہو گا۔“

”شانتی! رنجنا کو ایک منٹ بھی تنہا نہ چھوڑنا اور بچے کا خیال رکھنا۔ میں ڈاکٹر کو رپورٹ دینے جا رہی ہوں۔“ ———

”جی مالکن!“

اور وہ دونوں نکل جاتے ہیں۔

ساگر نے رنجنا کے سامنے اچانک آکر اُس کے شانت سمندر میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں موند لیتی ہے اور یادیں اُس کے چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اُس کا بچہ اُس کے پاس ہی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُس کی یاد آتے ہی وہ جلدی سے آنکھیں کھول دیتی ہے اور بچے کو سوتا دیکھ کر ایک اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ دھیرے دھیرے پھر اُس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ خیالات کے لامتناہی

سلسلہ میں اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ سن کر رنجنا آنکھ کھول دیتی ہے۔ شانتی کمرہ میں داخل ہو رہی تھی ——

"کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں" —— شانتی نے اطلاع دی۔

"مجھ سے؟" —— وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے حیرت تھی، یہاں اُس سے ملنے کون آسکتا ہے۔ کہیں ساگر تو نہیں؟؟ وہ ایک بار پھر گھبرا جاتی ہے۔ کتنی مشکلوں سے اُس نے اپنے کو منایا تھا مگر یہ ساگر......،

"جاؤ بھیج دو!" —— اُس نے اچانک بڑے گمبھیر لہجے میں شانتی سے کہا اور دروازہ کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد ساگر اُس کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا——

"تم بھی اسی شہر میں رہتی ہو مجھے معلوم نہیں تھا۔ رنجنا مجھے معاف کر دو، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ تم سے دور جانے کے بعد تمہاری بہت یاد آئی اور آج تک تمہاری یادوں کے سہارے ہی زندہ ہوں۔ مجھے یقین تھا رنجنا کہ تم ایک دن ضرور ملو گی۔"

رنجنا ساگر کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایک کشمکش تھی کہ سر سے پاؤں تک رنجنا کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔

دفعتاً کامنی اور منوہر کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں اُس کے پاس ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ کامنی نے ساگر پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی، پھر رنجنا سے مخاطب ہوئی——

"ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ سب ذہنی پریشانی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے کئی بار منع کیا کہ سایہ کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو۔ وہ جو کل تھا، تمہارا اتیت تھا اور جو آج ہے

وہ تمہارا ورتمان ہے۔ کل جو تمہارے ساتھ تھا وہ ایک سایہ تھا، جس نے ساتھ چھوڑ دیا اور آج جو کچھ ہے وہ ایک حقیقت ہے“ ——

ساگر نے کامنی کی باتیں سن کر سر جھکا لیا۔ پھر سر اُٹھا کر ایک نظر رنجنا کو دیکھا اور آہستہ آہستہ وہاں سے ہٹتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔

منوہر کو کچھ دیر کے بعد ساگر کے چلے جانے کا احساس ہوا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا مگر وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ منوہر نے رنجنا سے پوچھا ——

”جو شخص ابھی ابھی اُٹھ کر باہر چلا گیا وہ کون تھا؟“

رنجنا نے دروازے کی طرف دیکھ کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا —— ”ایک سایہ!“

●●

درد بھری زمین

لتاں فرقان کی باتیں سن کر دنگ رہ گئیں۔ پہلی بار اس خاندان میں بٹوارے کی بات اٹھائی گئی تھی۔ انہوں نے بڑی عجیب نظروں سے فرقان کی طرف دیکھا تھا۔ اُس نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ لتاں کا دل دہل گیا تھا اور وہ سوچ کی دنیا میں گویا غرق ہوگئی تھیں ——

دردبھری زمین پر ازل سے کوئی نہ کوئی حادثہ رونما ہوتا چلا آرہا ہے جس سے لمحہ لمحہ زمین کے درد میں اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن گھاؤ لگانے والے درد سے بے خبر، خون بہانے سے پہلے اور خون بہانے کے بعد اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے بجائے اپنی غلطیوں کا جشن شراب کی بوتلوں سے مناتے ہیں اور تب وقت کی تقدیر پر ایک المیہ کی تاریخ ثبت کردی جاتی ہے۔!

دردبھری زمین —— '

زمین کو کئی حصوّں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور بانٹا بھی جارہا ہے لیکن سورج کا

بٹوارہ کب ہوگا؟ چاند کا حقدار کون ہوگا؟ دھوپ کس کے قبضہ میں ہوگی اور چاندنی کس کے آنگن میں بسیرا کرے گی؟

لتاں سوچ کی دنیا میں غرق تھیں ——‘

فرقان نے لتاں کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی ——

’’لتاں یہ جو عمارت ہے جس میں، میں اور میرے دو بھائی رہتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرے حصے میں آجائے ....تم اپنی فکر نہ کرنا۔ تاحیات تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا لیکن یہ عمارت ....‘‘

فرقان کی تجویز کے تیر نے لتاں کے دل کو چھید ڈالا تھا۔ لتاں رات بھر مضطرب رہیں۔ انہوں نے وہ رات اپنے کمرہ میں ٹہلتے ہوئے گزار دی۔ اُن کے اندر ایک عجیب سی بے چینی تھی جس کا اظہار وہ کرنہیں سکتی تھیں اور نہ کسی کی سمجھ میں آسکتی تھی۔ پھر سمجھ کر بھی کوئی کیا کرلیتا۔ زخم لگانا تو آسان ہے مگر مرہم رکھنا بہت مشکل!—— کچھ زخم تو ایسے ہوتے ہیں جس کا مداوا بھی نہیں ہوتا، وہ زندگی کے ساتھ جاتے ہیں ——‘

پھر لتاں ——؟

فرقان کی بیوی نے اطلاع دی ——

’’لتاں کل سے بالکل خاموش ہیں۔ زیادہ تر اپنے کمرہ میں رہتی ہیں اور چھت کو گھورتی رہتی ہیں۔ پتہ نہیں انہیں کیا ہوگیا ہے؟‘‘

فرقان فوراً لتاں کے کمرے میں پہنچ گیا اور اُن کی خیریت دریافت کی۔ لتاں کافی غور سے فرقان کو دیکھتی رہیں، پھر اُن کی نگاہیں چھت پر جاٹکیں اور پھر کھڑکی سے باہر خلاء میں منڈلانے لگیں ——‘ جب فرقان نے کچھ زیادہ ہی اصرار کیا تو لتاں نے کہا —— ’’بیٹا ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا سر جسم سے الگ کررہا ہے۔‘‘

فرقان گھبرا سا گیا اور فوراً شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے چیک اَپ کے بعد ذہنی ٹنشن کی طرف اشارہ کیا۔ دوا تجویز کی اور چلا گیا ——

لمّاں کی طبیعت بشاش نہ ہوسکی۔ وہ اکثر آسمان کو گھورتی رہتیں۔ بہت کم بولتیں، کپڑے سیتے سیتے آنکھ اٹھا کر فرقان کی طرف دیکھتیں۔ ٹھنڈی سانس بھرتیں اور پھر سلائی میں مصروف ہوجاتیں۔ مگر ان ٹھنڈی سانسوں کو سمجھنے والا کون تھا؟ بہو تازہ اخبار لاکر لمّاں کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ لمّاں اخبار اُٹھا کر ایک نگاہ ڈالتی ہیں——

''کارگل میں درانداز وں اور ہندوستانی فوجیوں کے درمیان تصادم ——! پچاس درانداز ہلاک اور دس فوجی شہید۔''

لمّاں اس خبر کی تفصیلات پڑھتی ہیں اور پھر بڑبڑاتی ہیں ——

''زمانے کو کیا ہوگیا ہے۔ کیوں لوگ علیحدگی اختیار کرنے پر بضد ہیں۔''

''لمّاں! اس میں کسی کی سازش لگتی ہے۔ مجاہدین تو وہاں پہلے سے ہی لڑرہے تھے لیکن یہ درانداز پاکستان نے ہی بھیجے ہیں۔''

''جب اپنوں کے دل میں نفرت کا بیج پھوٹتا ہے تو اُسے سینچنے کے لیے بہت سے ہاتھ آگے آجاتے ہیں'' —— لمّاں نے اپنے دل کا پھپھولا پھوڑا۔

''لیکن لمّاں جب اپنے ہی باغی ہوجائیں تو انہیں دبانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''محض باغیوں کو کچل کر بغاوت ختم نہیں کی جاسکتی بلکہ بغاوت کے اسباب کو تلاش کرنا چاہئے، تب ہی کوئی حل نکالا جاسکتا ہے۔''

''تو لمّاں تمہاری نظر میں اس کا حل کیا ہونا چاہئے؟''

''یہی تو میں بھی کئی روز سے سوچ رہی ہوں۔''

''لماں! تم یہ سوچنا چھوڑ دو۔ اس پر سوچنے کے لیے ہمارے بہت سے سیاست داں تنخواہیں اُٹھا رہے ہیں۔ پہلے میرے بارے میں سوچو۔ میں نے تمہارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔''

''ہاں وہ تجویز ہر وقت میرے پیشِ نظر ہے اور ہر پل، ہر لمحہ میں تمہاری تجویز پر غور کر رہی ہوں۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکلے گا۔''

''لماں لیکن جلد ——''

''مرنے سے قبل تو کسی فیصلہ پر ضرور پہنچوں گی۔''

''لماں ایسی بات کیوں کہتی ہو؟''

''آج کل تمہارے ابو میرے خوابوں میں بہت آنے لگے ہیں۔''

''لماں بس کرو۔ تم آج کل عجیب عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔''

تبھی دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے اور فرقان باہر چلا جاتا ہے۔ جاتے ہوئے فرقان کو وہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتی ہیں پھر ٹھنڈی سانس لیتی ہیں اور تخت سے اُٹھنا چاہتی ہیں مگر لڑکھڑا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بڑی بہو جو سامنے کھڑی انہیں غور سے دیکھ رہی تھی، دوڑ کر آتی ہے اور اُنہیں سہارا دیتی ہے ——

''کیا بات ہے لماں! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''کچھ نہیں رے.......... بس یونہی .... آنکھ کے سامنے ذرا اندھیرا چھا گیا تھا۔''

''لماں اگر دل میں کوئی بات ہے تو کہہ دیجئے۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بیٹی کی طرح سمجھا ہے۔''

لماں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا —— ''خدا سے دعا کروں گی تم لوگوں کی ہر خواہش پوری ہو جائے —— مجھے میرے کمرے میں پہنچا دو، نماز کا

وقت ہو گیا ہے۔''

آفتاب ڈوب چکا تھا۔ دھندلکا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ لمّاں کا کمرہ ابھی تک اندھیرا تھا۔ آج وہ سر شام ہی اپنے کمرہ میں چلی گئی تھیں اور خاموشی سے بستر میں لیٹی ہوئی تھیں۔ روشنی آن کرنے کی بھی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں آواز دے رہا ہے ——

''لمّاں!''

وہ اٹھنا چاہتی ہی تھیں کہ کمرہ کی روشنی جل اُٹھتی ہے۔

''کون عدیل؟'' —— لمّاں نے اپنی آواز صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں لمّاں۔ میں ہی ہوں۔''

لمّاں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔

''لمّاں! تم نے کمرہ اندھیرا کیوں کر رکھا تھا؟''

''ارے، اب اندھیرے کی گرفت مجھ پر مضبوط ہوتی جارہی ہے اور میں اس کی عادی ہوتی جارہی ہوں۔''

''لمّاں! یہ کس ناول کا مکالمہ ہے۔ لگتا ہے تم اب بھی ناول پابندی سے پڑھتی رہتی ہو۔''

''یہ کسی ناول کا مکالمہ نہیں، میرے وجود کے احساس کی زبان ہے جو لمحہ لمحہ اپنا پنجہ میری طرف بڑھاتی آرہی ہے۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ لمّاں! آج تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔''

''تو بھی کچھ کہہ ڈال۔ دل میں رکھے گا تو میری طرح تیرا وجود بھی لہولہان

ہو جائے گا۔''

''لتاں سنا ہے کہ بڑے بھیا اس عمارت کو اپنے نام کرانا چاہتے ہیں؟''

''ٹھیک ہی سنا ہے تو نے۔''

''مجھے اِس عمارت میں کوئی دلچسپی نہیں، لیکن مشرق کی جانب جو زمین ہے جہاں فصل لگی ہوئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم وہ زمین میرے نام کردو۔ میں اُس کے ایک کنارے پر ایک خوبصورت سا فلیٹ بنواؤں گا اور وہیں بال بچوں کے ساتھ زندگی گزاروں گا .... لتاں تم بھی میرے ساتھ ہی رہوگی۔ تمہیں میرے بچوں سے کتنا پیار ہے اور بچے بھی تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔''

لتاں نے اچانک محسوس کیا کہ اس دنیا میں اُن کا وجود محض فرضی ہے۔ پھر اس نے کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا جہاں چمکتا ہوا چاند کبھی بادل میں روپوش ہوجاتا، کبھی نکل آتا۔ آج وہ اس وسیع دنیا میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہیں۔ رات دبے پاؤں گذر رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی کا پہرا تھا مگر وہ جاگ رہی تھی۔ لمحہ لمحہ اُداسی کی چادر دبیز ہوتی جارہی تھی۔ نیند پتہ نہیں وقت کے کس انجانے موڑ پر رہ گئی تھی اور پتہ نہیں اُسے کس کا انتظار تھا۔ دل تھا کہ رہ رہ کر دھڑکے جارہا تھا۔ وہ چیخ کر رونا چاہتی تھیں مگر آنکھوں میں آنسوؤں کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور پھر اُن آنسوؤں کو کون دیکھے گا اور اگر دیکھ بھی لیا تو ان آنسوؤں کا ردِّعمل اثبات ہی ہوگا یا نفی میں ــــــ؟

صبح ہوئی تو عدیل لتاں کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے حاضر ہوگیا ــــــ

''لتاں! تم کو کوئی تکلیف ہے کیا؟ ایسا لگتا ہے، تم رات بھر نہیں سوئی ہو؟''

''نہیں بیٹا! اب اس بڑھاپے میں کیا تکلیف ہوگی، البتہ ایسا لگتا ہے کہ میرا

وجود دھیرے دھیرے بکھر رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے، بس جتنے دن زندہ رہ لوں، غنیمت ہے۔''

''لمّاں تم فکر نہ کرو، تمہارے تین تین بیٹے ہیں۔ علاج میں کوئی کمی نہیں آنے دی جائے گی۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر تمہارے علاج کے لیے دوڑا آئے گا۔ تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گی۔''

''ارے میری فکر مت کر، جا اپنا کام دیکھ'' ——— لمّاں نے محبت سے ڈانٹا۔

''اچھا لمّاں آفس جاتے ہوئے میں ڈاکٹر کو تمہارا حال کہتا جاؤں گا۔ اُس نے ضرورت محسوس کی تو وہ آ کر پھر چیک اَپ کر جائے گا، تم ذرا بھی نہ گھبرانا۔''

عدیل چلا جاتا ہے۔ بہو دودھ کا گلاس لے کر حاضر ہوتی ہے۔

''لمّاں دودھ پی لیجئے۔''

لمّاں گلاس ہاتھ میں لے لیتی ہیں۔

''بہو! ذرا ٹی وی آن کرنا۔ نیوز کا وقت ہوگیا ہے۔''

بہو نے آگے بڑھ کر ٹی وی آن کردیا۔ خبریں آ رہی تھیں۔

''آسام کے دہشت پسندوں نے یوم آزادی کا بائیکاٹ کیا۔ کئی سرکاری عمارتوں کو ڈائنامیٹ سے اُڑادیا............''

''بہو ٹی وی آف کردو۔ دہشت گردی کے علاوہ ان لوگوں کو کوئی خبر ہی نہیں ملتی۔''

لمّاں کی آنکھیں اُداس ہوجاتی ہیں۔ ان کی نگاہ ایک طرف ٹنگی اُن کے شوہر کی تصویر پر مرکوز ہوجاتی ہے۔ آنکھوں کے کنارے بھیگ جاتے ہیں اور ہونٹ کپکپا اُٹھتے ہیں ———

''آپ کی قبر تو پاکستان میں ہے جہاں آپ کے بیٹے فاتحہ پڑھنے بھی نہیں جاسکتے لیکن میری قبر کہاں ہوگی؟ کس بیٹے کی سرزمین پر؟ کیونکہ ہر بیٹا مجھے بانٹنا چاہتا ہے۔'' ــــــــ

اور للاں کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگتی ہیں۔

● ●

''منڈیر پر بیٹھا پرندہ''

پر

اظہار خیال

اقبال مجید

ان بیس افسانوں میں کچھ افسانے جیسے منڈیر پر بیٹھا پرندہ، بے پناہ جنگل اور وجود، شہر چھوڑتا نہیں، عجوبہ، کرفیو کب ٹوٹے گا وغیرہ کے دروازوں پر ایک ہی طرح کے انجانے خوف و ہراس کا قفل لگا ہوا ملتا ہے۔ اس خوف و دہشت اور اس کے ساتھ ایک انجانی اور غیر واضح سراسیمگی اور اس سراسیمگی کے ایک جیسے اسباب چند جملوں یا بیانوں یا مکالموں میں دُہرائے گئے ہیں لیکن ان دروازوں پر لگے تالوں میں سے کسی تالے کے کھلنے کی نوبت نہیں آئی اور قاری نہ تو اس برائے نام خوف سے خائف ہوتا ہے اور نہ اس دہشت سے وحشت زدہ۔ لہٰذا کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مصنف کے دل و دماغ میں بسا ہوا خوف یا دہشت یا سراسیمگی قاری کے لئے اہم نہیں ہوتی۔ بات تو جب بنتی ہے جب وہ خوف افسانوی تجربے کا پراثر حصہ بن کر قاری کے تجربے کا بھی ایک حصہ بن جائے۔ کہتے ہیں کہ خوف کا وجود باہر نہیں ہمارے اندر ہی ہوتا ہے۔ وہ باتیں جو ہمیں خوف زدہ کرچکی ہیں یا کرتی رہتی ہیں۔ ان کو افسانوی حقیقت میں شامل نہیں ——— بلکہ افسانوی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے خائف ہونے لگیں جو بظاہر خوف زدہ کرنے والی نہیں۔ لگتا ہے افسانہ نگار اس حقیقت سے واقف ہے اور اس نے اپنے ایک افسانے میں منڈیر پر بیٹھے ایک پرندے کے ذریعہ یہ کام کرنا بھی چاہا ہے، مگر افسوس وہ پرندہ بھی خوف کو مہمیز کرنے میں خود کو ایک مثبت

قوت نہ بناسکا۔

تاہم ان افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنی تخلیقات کے بہانے آج کے داخلی اور بیرونی خوف و ہراس کو موضوع بنا کر مختصر افسانے کے طاقت ور، موٴثر اور تہہ دار محاورے سے مکالمہ قائم کرا کے اسے گرفت میں لینے اور سمجھنے سمجھانے کی بے غرض کوشش کر رہا ہے۔

(نیا دور، لکھنؤ، مارچ ۱۹۹۷ء)

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ

کبھی کبھی روشنیٔ طبع خود اپنے لئے متعدد مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ احمد صغیر کی روشنیٔ طبع ان کے عصری تعیین میں دشواری پیدا کر دیتی ہے۔ بہر حال، یہ بات طے ہے کہ وہ ہمہ وقت ادب سے وابستہ ہیں اور تخلیقی اعتبار سے متحرک ہی نہیں مضطرب بھی ہیں۔

احمد صغیر مختصر افسانے کی فنی ہیئت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے عصر سے جڑے ہوئے ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں آج کے وہ مسائل صاف نظر آتے ہیں جن سے ہمارے معاشرے کے افراد دوچار ہو رہے ہیں، فن کار بھی دوچار ہو رہا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک مخصوص طرز کا تخلیقی ابہام نظر آتا ہے، ایک بے نام سا خوف، ایک ایسی فضا جہاں یکا یک سلسلہ نفس کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔ کوئی آنے والا خطرہ، ذہن و جسم کے معطل کر دینے والے وقوعوں کا احساس —— یہ سارے احساسات احمد صغیر کے یہاں ایک سوچ کی طرح اُبھرتے ہیں۔

جب تک وقوعوں سے گزر کر فن کار فکر کی منزل کی طرف نہیں جاتا اس وقت تک اس کے فن میں عظمت پیدا نہیں ہو سکتی۔ کہانی ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' احمد صغیر کی

ٹائٹل اسٹوری بھی ہے اور ان کی نمائندہ کہانی بھی۔ ہر آن آنے والی مصیبت کے ایک انجانے خوف اور ماضی بعید سے ایک اٹوٹ نفسیاتی رشتے سے لت پت یہ کہانی فن کار کے تخلیقی رویے کی پہچان ہے۔ احمد صغیر کو ابھی ایک سفر کرنا ہے۔ وقوعوں سے ان کے فلسفیانہ نتائج تک کا سفر، سنگین حالات کی پینٹنگ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

''پرندہ'' احمد صغیر کے تخلیقی اظہار کا ایک متحرک وسیلہ ہے۔ کبھی یہ منڈیر پر آ کر گھورتا ہے (منڈیر پر بیٹھا پرندہ)، کبھی خشک شاخوں پر غول بنا کر ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے اور بدحواس ہوتا ہے (سرنگ)، کہیں یہ زخمی ہے اور اس کی پھڑ پھڑاہٹ سماعت سے ٹکراتی ہے (بے پناہ جنگل اور وجود)، کبھی پانی میں اُڑان بھرنے کے لئے پر تولتا ہے (عجوبہ)، کبھی اپنے پنجرے اور گھونسلے کی کہانی سناتا ہے (اپنا اپنا پنجرہ)۔

احمد صغیر کہانی کے بنیادی آرٹ سے واقف ہیں۔ ان کا نکلتا ہوا قد ان کی سرو قامتی کی ضمانت دے رہا ہے۔

(ایوان اردو، مارچ ۲۰۰۰ء)

محمد مثنیٰ رضوی

احمد صغیر کی مشہور کہانی ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' اس افسانوی مجموعہ کی پہلی کہانی ہے جن کا بنیادی وصف یہ ہے کہ اس میں علامت ابہام اور پردہ داری کی شعوری کوشش کے بجائے معنوی توسیع کا وسیلہ بن جاتی ہے اور کہانی کو زیادہ تہہ دار اور پراثر بناتی ہے۔ تشدد اور استحصال کے خلاف فن کار کا احتجاج اس کہانی کی روح ہے مگر احمد صغیر نے اسے علامتی انداز میں پیش کر کے اس میں جو گہرائی، معنویت اور دیرپا کیف پیدا کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ پرندہ اُن کی کئی کہانیوں میں علامت بن کر اُبھرا ہے مگر ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' عام پرندوں سے بالکل الگ وجود رکھتا ہے۔ آ گ

اور خون کا کھیل کھیلنے والی قوتیں امن عالم کو جس طرح تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ کہانی اس کے خلاف ایک ایسے فن کار کا احتجاج ہے جس کی روح بیدار ہے اور ضمیر روشن۔

اب ذرا دوسرے پرندوں کا حال بھی سنئے۔ پرندہ دراصل اُن کے یہاں ایک بے بس اور لاچار انسان کی علامت ہے جو منڈیر پر بیٹھے مٹھی بھر پرندوں کی سفاکانہ ہوسنا کی کا شکار ہو کر اپنی صلیبیں خود اپنے کاندھوں پر لئے خاموش کھڑے ہیں۔ فن کار اُن کی اس بے بس اور سراسیمہ خاموشی کو احتجاج کی آواز عطا کرتا ہے۔

احمد صغیر کی خوبی یہ ہے کہ پیچیدہ اور متنوع موضوعات کے باوجود اُن کی کہانیاں اپنے تاثر کی وحدت کو شروع سے آخر تک برقرار رکھتی ہیں۔ کہانی کا تار و پود کہیں بکھرتا نہیں۔ یہی کہانی کہنے کا فن ہے اور اس ڈھنگ سے احمد صغیر بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی بات کم سے کم لفظوں میں کہنے کا گُر جانتے ہیں۔

(استعارہ، شمارہ ۴)

حسین الحق

احمد صغیر کی کتاب میں شامل بیس افسانوں میں سے دس افسانے (۱) منڈیر پر بیٹھا پرندہ (۲) بے پناہ جنگل اور وجود (۳) مسیحا کون رہا (۴) اپنا اپنا پنجرہ (۵) عجوبہ (۶) کیچ کیچ ہا (۷) تاریکیوں کا رقص اور میرا وجود (۸) محض انتظار (۹) آگے بڑھتا ہوا آدمی (۱۰) منظر منظر دھواں دھواں —— کا اسلوبیاتی نظام استعاریہ، تشبیہی اور تمثیلی ہے اور بقیہ دس افسانوں میں (۱) کچھ بھی تو نہیں بدلا (۲) سرنگ (۳) سفر ابھی ختم نہیں ہوا (۴) کرفیو کب ٹوٹے گا اور (۵) شکستہ لمحے —— پانچ افسانوں کے عنوانات ہی بتا رہے ہیں کہ یک رُخی رجائیت کے جال میں

احمد صغیر گرفتار نہ ہو سکے۔

اس لئے بلا جھجک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۸۰ء کے بعد کے افسانہ نگار (جن کی نمائندگی اس وقت احمد صغیر کر رہے ہیں) نہ تو ترقی پسندوں کی طرح یک رُخے رجائی ہیں اور نہ غالی جدیدیوں کی طرح اظہار میں مبہم اور مہمل علامت نگاری کے شائق۔

بحیثیت افسانہ نگار: احمد صغیر اپنی دو کہانیوں (۱) سفر ابھی ختم نہیں ہوا (۲) کرفیو کب ٹوٹے گا؟ میں فنی لحاظ سے کافی حد تک کامیاب ہیں اور میں ان کے کچھ دوسرے افسانوں کی روشنی میں (جنھیں میں پڑھ چکا ہوں اور جو غالباً احمد صغیر کے دوسرے افسانوی مجموعے ''انا کو آنے دو'' میں شامل ہیں) صمیم قلب کے ساتھ یہ امید کر سکتا ہوں کہ احمد صغیر مستقبل کے اُردو افسانے کے ایک قابل ذکر شریک ہیں۔

(زبان وادب، مئی، جون ۱۹۹۶ء)

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

احمد صغیر بنیادی طور پہ دہشت اور تناؤ (Terror and Tension) کے مفسّر ہیں جس کا دائرہ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نسل انسانی اخلاقی اعتبار سے زوال کی آخری حد پہ ہے۔ قانون بے بس ہے اور نہ صرف ہمارا ملک بلکہ یہ پوری دُنیا خوف و دہشت کی زد پہ ہے۔ شہر جنگلوں میں اور انسان حیوانوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ فرقہ واریت، علاقائیت، نسلی امتیازات اور لسانی و طبقاتی تصادمات نے پورے معاشرے کو لہولہان کر رکھا ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ پابندئ سلاسل بھی دہشت گردوں اور قاتلوں کا نہیں معصوموں کا مقدر ہے۔ احمد صغیر کے بیشتر افسانے انھیں نکات کی فن کارانہ پیش

کش سے عبارت ہے۔

(آج کل، جون ۱۹۹۷ء)

سید احمد قادری

اپنی فنی صلاحیتوں، فکری آگہی اور سیاسی، سماجی و معاشرتی شعور کو بروئے کار لاکر افسانوی ادب میں اپنی منفرد پہچان بنانے والوں میں احمد صغیر کا نام نمایاں ہے۔

احمد صغیر نے اپنے افسانوں کے موضوعات اپنے اردگرد کے حالات و مسائل سے پیدا ہونے والے واقعات اور حادثات کو بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد صغیر کے افسانے قاری کے دل و دماغ پر گہرا تاثر قائم کرنے میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ پوری شدت سے اپنی آفاقیت کو تسلیم کرالینے کی قوت رکھتے ہیں۔

زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔ اِن میں کئی افسانے ایسے ہیں جو فکری آگہی اور فنی ادراک کے عمدہ نمونے ہیں۔ اِن افسانوں میں احمد صغیر نے اپنی سماجی، سیاسی اور معاشرتی بصیرتوں کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اُردو اور ہندی فکشن کا بڑا اہم موضوع رہا ہے۔ مختلف فن کاروں نے اس موضوع کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا ہے، لیکن احمد صغیر نے ''کچھ بھی تو نہیں بدلا'' میں فرقہ پرستی کی تلخ حقیقت کو اس خوش اسلوبی سے افسانوی قالب میں ڈھالا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

''نہیں چاہئے مجھے یہ بھیک، میں بھوکوں مرنا قبول کروں گی مگر تیرے ہاتھ سے ایک دانہ بھی نہیں لوں گی ...... ظالم ...... لٹیرا ...... سب کچھ لوٹ کر امداد بانٹ رہا ہے ...... تو ...... تیری جرأت کہ تو ...... نہیں ....'' (صفحہ ۲۱)

عین تابش

احمد صغیر نے آج کی زندگی، اس کے لینڈ اسکیپ اور ساتھ ہی بیسک ڈراپ کو بھی اپنی تخلیقیت کے قریب کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے زندگی کو اکثر اس کی تلخیوں اور بدمزگیوں میں دیکھا ہے اور ان میں بہت ساری کڑواہٹیں یقیناً وقتی ہیں جن کو سامنے رکھ کر حیات و کائنات کے باب میں بڑے فیصلے نہیں کیے جاسکتے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ احمد صغیر اور ان کے دوسرے ہم عصر اگر زندگی کے خوب و زشت کا مطالعہ غیر جانب دار ہوکر کریں تو تخلیقی آنچ کی اس کمی کو دور کرسکیں گے جو منفی عناصر مثلاً خوف، سراسیمگی، دہشت زدگی اور اُکتاہٹ سے پیدا ہوتی ہے۔

''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' بیانیہ کے اس دور میں استعارے کی بازیافت کا نمونہ ہے جو منڈیر پر ہی کہیں آدمی کے دل میں موجود ہے۔ خوف اور شک کا یہ پرندہ ہر لمحہ اپنے ہی اندر سے نمودار ہوتا ہے۔

(اثبات ونفی، شمارہ ٦)

ڈاکٹر نسیم ابن صمد

احمد صغیر عصر حاضر کے اردو افسانہ نویسیوں اور کہانی کاروں کی صف میں شامل ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو زندگی کے مثبت انداز اور صالح روایات کی آئینہ داری اور عکاسی و ترجمانی کرنے کے علاوہ مختلف رجحانات ومیلانات اور نظریات وتصورات کی امتزاجی کیفیات اور مزاج وروّیہ سے فیضان حاصل کرتے ہوئے اپنے فن پاروں میں ان تمام نکات و جہات کو پیش کرکے ایک الگ متعینہ راہ اور منفرد نشان وپہچان بنانے کی عملی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

احمد صغیر صالح روایات کے واقف کار اور نئے کیانوی مزاج کے نبض شناس

ہیں۔ ان کی کہانیاں نئی نسل کے ذہنی سفر اور فکری نہج کو سمجھنے میں از حد معاون ہیں۔

(سخنور، کراچی)

ڈاکٹر ابرار رحمانی

اردو افسانے کی جدید ترین نسل میں احمد صغیر ایک اہم نام ہے۔ وہ پچھلے دس بارہ سالوں سے تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور مختلف رسالوں میں شائع بھی ہو رہے ہیں۔ احمد صغیر کا اب تک ایک مجموعہ شائع ہوا ہے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' مجموعے میں چھوٹے چھوٹے بیس افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ ''جلدی میں'' نہیں ہیں۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہمارے نوجوان اکثر 'جلدی میں' نظر آتے ہیں۔ اسی جلد بازی کا نتیجہ ہے کہ اکثر ان کا اپنے قلم پر قابو نہیں ہوتا اور 'فکر' بھی بے توجہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

'منڈیر پر بیٹھا پرندہ' کی کہانیوں میں کچھ کہانیاں علامتی اور استعاراتی ہیں، جن میں خود ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' نام کی کہانی بھی شامل ہے۔ یہ کہانی اس مجموعہ کی کلیدی کہانی بھی ہے۔ 'پرندہ' ترقی، عروج اور کامیابی کا سمبل بھی ہے اور یہی پرندہ جب نیچے اتر کر منڈلانے لگے تو سمجھئے کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے یا آ چکی ہے۔ اور پھر جب یہی پرندہ منڈیر پر اتر آئے اور سرخ سرخ آنکھیں دکھلانے لگے تو انسان کے پاس سوائے راہ فرار اختیار کرنے کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کا دور 'پرندہ' کے نیچے اتر آنے کا دور ہے۔ اور آج کا انسان خوف، سراسیمگی اور کرب و بے چینی کے دور سے گذر رہا ہے۔ احمد صغیر کی کہانی 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' بلاشبہ اپنے دور کی عکاسی کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہانی کا یہ آخری حصہ جس میں کہانی کار نے 'پرندہ' کو

بھگا کر چین کا سانس لیا ہی تھا:

''پھر میں ان سارے خیالات کو جھٹک دیتا ہوں—— کافی بار میں بیٹھ کر ایک کپ کافی پیتا ہوں۔ بک اسٹال پر کھڑا ہوکر Debonair کا سرسری مطالعہ کرتا ہوں۔ 'آج کل اچھی تصویر بھی نہیں چھاپ رہا ہے۔' بہر کیف! ایک کاپی خرید کر گھر کی طرف چل پڑتا ہوں۔ دروازہ بیوی کھولتی ہے۔ میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ خود بخود میری نگاہ منڈیر کی طرف اٹھ جاتی ہے، وہ پرندہ پھر وہاں بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔''

یہ 'پرندہ' بلاشبہ عفریت کا سمبل ہے جو نہ صرف کہانی کار کے اعصاب پر بلکہ آج کے عام انسان کے دل و دماغ پر پوری طرح سوار ہے۔

میں نے یہاں پرندہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ کیوں کہ احمد صغیر کی کہانیوں کا یہ ایک اہم استعارہ ہے بلکہ 'پرندہ' احمد صغیر کی کہانیوں کا اسم اعظم ہے۔

ان کی دوسری کہانیوں میں بھی اس استعارہ سے خوب خوب کام لیا گیا ہے۔ ان کی ایک کہانی ہے 'سرنگ' سرنگ کا یہ جملہ دیکھئے:

''خشک شاخوں پر بیٹھے پرندوں کا غول بوکھلا کر ایک دوسرے سے ٹکرا گیا تھا۔ آپس میں الجھ الجھ کر پرندے بدحواس ہو اٹھے تھے۔ چاروں سمت دھول ہی دھول دکھائی دیتی تھی۔ خاموشیوں، مایوسیوں اور بے رحم سناٹے کو چیرتی، چھیدتی، لرزتی، کانپتی، تاریک آسمانوں پر کتنے ظلم ہوئے تھے۔''

مذکورہ اقتباس میں کلیدی الفاظ 'پرندوں کا غول' اور اس کی بوکھلاہٹ سے کہانی کار نے بلاشبہ ایک بڑے پس منظر کا کام لیا ہے۔ جس کے لئے بہت سے دوسرے افسانہ نگار ایک بڑے کینوس کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

احمد صغیر میں ٹیلنٹ ہے۔ بلاشبہ اس مجموعہ کی کہانیوں سے ان کے ٹیلنٹ کا

اظہار ہوتا ہے۔

میں نے اپنے ایک مختصر مضمون ''۱۹۶۰ء کے بعد اردو کہانی'' میں بجا طور پر نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو ناقد نہ ملنے کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''آٹھویں اور نویں دہائی کے افسانہ نگاروں کا تو اور بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ گرچہ اس دور میں بہت جوشیلے اور خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والے نظر آئے۔ ان میں سے بہت سے تو اپنے پیش رووں سے آنکھیں ملانے بلکہ آنکھیں دکھانے والے جی دار بھی پیدار ہوئے۔ اور یہ بہت کچھ اس بات کا ردعمل تھا کہ اس نئی نسل نے نہ تو اپنا ناقد بنایا اور نہ ہی پیش رو نقادوں نے بہت زیادہ ان کو قبولیت بخشی۔

احمد صغیر بھی اس سے اچھوتے نہیں ہیں۔ انہیں بھی اپنے دوسرے معاصر افسانہ نگاروں کی طرح اپنا نقاد نہ ملنے کی زبردست شکایت ہے۔ انہیں میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ٹیلنٹ اور صلاحیت خود اپنا لوہا منواتی ہے۔ اگر آپ کے اندر واقعی ٹیلنٹ ہے تو پھر اس کی پروانہیں کرنی چاہیے۔ بس اپنا کام کرتے جانا چاہئے۔

ڈاکٹر کوثر مظہری

احمد صغیر کی کہانیوں کا جو سب سے بڑا وصف مجھے سمجھ میں آیا وہ اختصار نویسی اور پھر ایجاز میں فکری ارتکاز۔ احمد صغیر ''اندو'' کردار سے پورے چاند کی کتھا نہیں بیان کرتے، ان کے یہاں سوم اور سوم رس یا اساطیر الاولین پر یا پھر متھ پر مبنی کہانیاں نہیں ہوتیں، وہ تو آس پاس کے ہنگامہ خیز حالات اور تکدر آمیز ماحول سے مرکزی خیال اخذ کرتے ہیں اور پھر کہانی کا تانا بانا بننا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اگر غور کریں تو ایک (Chain of Events) ملے گا۔ ایک کہانی ہے ''کرفیو

کب ٹوٹے گا؟'' اس میں تین دوست ایک نالے کے پائپ میں چوبیس گھنٹے سے چھپے بیٹھے ہیں۔ باہر کرفیو ہے جس میں نکلنا مشکل ہے، بھوک اور پیاس سے تینوں بیاکل ہیں۔ مختلف فقرے دیکھئے: ''ہمارے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی ہے، اگر پانی نہیں ملا تو ایسے ہی جان چلی جائے گی یار بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔'' اس کے بعد ظفر کہتا ہے: ''روپئے تو ہیں لیکن باہر جائے گا کون؟'' اس کے بعد مولا بخش کا احساس: ''جان جارہی ہے، چوبیس گھنٹے سے مسلسل پیاسا ہوں۔'' اب ذرا اس کرفیو سے پیدا حالات کی شدت ملاحظہ کیجئے: وہ پیچ وتاب کھاتا رہا۔ وہ فیصلہ کرنا چاہتا ہے کہ پیاس کی شدت سے مرجائے یا باہر نکل کر کسی کی گولی کا شکار ہوجائے...... نگاہیں خاموش سنسان ماحول کی بے حسی کا جائزہ لیتی ہیں، تبھی اچانک باہر سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے اور پھر ایک چیخ!...... ''اٹھا کر نالے میں ڈال دو۔'' یہ منظر کتنا کریہہ ہے، ہم سب واقف ہیں۔ اسی طرح ''کرب کا لاوا'' پنجاب میں دہشت گردی اور خونیں منظر کو پیش کرتی ہے۔ اگر احمد صغیر کی کہانی ''شگاف'' کی صنوبر کو اور اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھیں تو یہ بھی منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کی اس لڑکی کی طرح ہے جس کے ذہن پر فساد اور اس میں اس کے ساتھ کی گئی جنسی بدفعلی سے ایک ہی مفہوم ابھرتا ہے۔ یعنی ''کھول دو'' سے وہ صرف اپنی شلوار کی ڈوری کا کھول دینا ہی سمجھتی ہے کہ اس عمل کے تسلسل نے اس کی نفسیات بدل کے رکھ دی ہے۔ کسی طرح کی آواز پر صنوبر چونک جاتی ہے اور چیخنے لگتی ہے۔ ''آگ آگ، بچاؤ، بھاگو...... سائرن پولس...... دھائیں...... نثار اسے سمجھاتا ہے ''صنوبر یہ پولس کا سائرن نہیں ہے، جوٹ مل کے بند ہونے کی آواز ہے، میں ابھی دروازہ کھول کر دیکھتا ہوں......'' صنوبر روتی ہوئی کہتی ہے: ''نہیں دروازہ مت کھولنا وہ اندر گھس آئیں گے......'' اسی درمیان کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، ممی دروازہ کھولنے کے لیے بڑھتی ہیں، صنوبر چیختی ہوئی صحن سے بھاگتی

ہوئی پچھلے دروازے سے سڑک پر نکل جاتی ہے۔ مفلوج ذہن اور آنکھوں کی بے بسی کا قشہ یہ کہانی پیش کرتی ہے۔ صنوبر کی ماں باپ اور گھر کے دوسرے سارے لوگ چوں کہ فساد میں مارے گئے تھے اس لئے اس کا بدنما منظر اور اس کی دہشت صنوبر کی سوچ کو مفلوج کر گئی تھی۔ اس انسانیت سوز منظر سے ہر آدمی پناہ مانگتا ہے۔ ''آگے بڑھتا ہوا آدمی'' ''کیچ کیچ ہا'' ایسی کہانیاں ہیں جو احمد صغیر کی تخلیقی کائنات کی دہشت زدہ تصویر کو پیش کرتی ہیں۔ صغیر کی تحریر میں انسانی تہذیب، کرب اور اضمحلال، مایوسی، سفر کی تکان، حادثے اور وقوعے، معاشرے کی گریہ وزاری، پولس، فساد، کشمکش حیات، رونا ہنسنا، بے حسی، خطرات، علامتی، رموز، سیاسی شعبدہ بازی، جبر واستحصال، نیکی بدی، ساحل، منجدھار اور نہ جانے زندگی سے متعلق کتنے اور کیسے کیسے انسلاکات موجود ہیں۔ ان کے یہاں استفہامیہ انداز بھی بیانیہ میں موجود ہے۔

(سخنور، کراچی، جنوری ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر مولا بخش

اردو کے بیشتر افسانہ نگار افسانہ لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اس صنف کا تعلق فن نثر نگاری سے ہے اور نثر کی اپنی فطرت یا بوطیقا ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ افسانہ کہانی کی شکل میں پیش کر دیا گیا ہو۔ اردو کے رومانی دور میں اور جدیدیت کے زمانے میں تو اس میں غزل کے رموز و علائم کثرت سے داخل کئے گئے اور اسے نثری غزل یا خود کلامی کی شکل میں فلسفیانہ مقالہ بنا دیا گیا۔

میرے نزدیک افسانہ نثر کی خصوصیتوں مثلاً وضاحت وصراحت، تشریحیت، پھیلاؤ کو اس طرح سے تکثیر معنی سے جوڑنے کا عمل ہے جس میں کہانی پن کے بنیادی حسن ''پھر کیا ہوا'' کو منطقیت، واقعیت اور یعنی اختصار نویسی (جو نثر کے تعمیری عناصر

کی پیدا کردہ ہو، مثلاً اصطلاح، محاورہ، ضرب المثل، کوما، پیراگراف، اوقاف، استعارہ، تمثیل وغیرہ) کے ذریعے اچھی طرح کسا گیا ہو، بُنا گیا ہو، جو قرات کی کئی ایک سطحیں رکھتا ہو، جس کی ہر قرات متن سے اسی طرح کا مفہوم وضع کرتی ہو نہ کہ جدیدیت کے تلے لکھے گئے افسانے کی طرح معنی کی تلاش میں قاری کے بال سفید کرنے میں مہارت رکھتی ہو۔

تقریباً ۱۹۸۰ء کی دہائی سے ہی اردو افسانے میں جدیدیت کی بعض انتہا پسندیوں پر شدید ردِّعمل کا دور شروع ہوا اور پھر ادب میں سماج کے مطالعے اور فرد پرستی کی روش دونوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش شروع ہوگئی۔ اس طرح افسانہ کہانی پن سے جڑا اور اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کا عمل شروع ہوگیا۔ اس دور کے نمائندہ افسانہ نگاروں کے یہاں مذکورہ بالا شکایتیں حتی الامکان کم ہوگئیں۔ مثلاً یہ رجحان واضح طور پر مشرف عالم ذوقی، سید محمد اشرف، سلام بن رزاق، طارق چھتاری، آصف فرخی، قاسم خورشید، خورشید اکرم کے علاوہ احمد صغیر کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں مجھے احمد صغیر کے افسانوی مجموعے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' پر بحث کرنی مقصود ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ احمد صغیر موجودہ افسانے یا ہم عصر اردو افسانے کے منظرنامے پر کہاں ہیں؟

''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' میں کل بیس افسانے ہیں جو ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۵ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں ہندوستان کے سماجی و سیاسی نیز اقتصادی رویوں میں کتنی خطرناک تبدیلیاں آئیں آپ کی نگاہ ان پر ضرور ہوگی۔ فسادات نے نئی کروٹیں بدلیں اور بھاگلپور کے فساد کے بعد بابری مسجد کے انہدام تک یہ بات سامنے آگئی کہ جس ہندوستان میں تیس فیصد لوگ فرقہ پرست ہوتے تھے اب وہ تعداد تین گونی ہوگئی ہے۔ ہر طرح کے مہابیانیے اور مرکزے پر گہری چوٹ پڑی۔ سیاست میں مرکزی پارٹیوں کا بندر بانٹ ہوگیا اور علاقائی پارٹیوں کی حیثیت مرکزی ہوگئی۔ بقول

منور رانا ٹوٹا پھوٹا ناچنے لگا اور اچھا خاصا ٹوٹ گیا۔ نکسلی تحریک نے خون کی ایسی ایسی ہولیاں کھیلیں کہ انسانیت کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ادھر میڈیا میں زبردست انقلاب آیا کہ اس عہد کو ہی انفارمیشن ٹکنالوجی کا عہد کہا جانے لگا۔ علم خرید وفروخت کی شے بنا، علم کا طور بدلا، تماشہ سوسائٹی کا چلن ہوا۔ ادب انٹرنیٹ پر منتقل ہوگیا، پرنٹ میڈیا کمزور ہوگیا، اسکرین میڈیا نے ادب کو تصویروں میں بدلنا شروع کردیا۔ قاری یعنی پڑھنے کے کلچر سے نئی نسل کو کاٹنے کے لیے یہ سامان کافی ٹھہرا، ایسے میں کسی بھی تحریری ادب پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور خاص طور سے کہانوی اصناف میں کن کن تبدیلیوں کی ضرورت پیش آرہی ہے اس پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ آج کا افسانہ نگار ان مسائل پر سوچ رہا ہے اور زبان کی سطح پر تبدیلیاں لانے کی بھی کوشش کررہا ہے کہ قاری تصویر کے بجائے لفظ پر اپنا ذہن مرکوز کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ احمد صغیر کے متن میں مذکورہ بالا خوف سے نبرد آزما ہونے کی بھرپور صلاحیت نہیں ہے تاہم اس متن میں ان مسائل کو پیش نظر رکھا ضرور گیا ہے اور کہانی کو نری کہانی نہ بنا کر آج کے المیے کو مکالمہ بنانے اور اس پر فنکارانہ تجزیہ کرنے کے عمل سے جوڑا گیا ہے جو شاید اسکرین پر ہمیں نظر نہ آئے گا، اس کے لئے ہمیں لامحالہ Viewer نہ بن کر Reader ہی بننا پڑے گا۔ مثلاً میں احمد صغیر کے افسانوی متن سے کچھ ایسے تصورات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جن کے سبب وہ افسانے کی تخلیق پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ اس عمل میں کسی نہ کسی طور پر قاری بھی شریک ہے۔

پیش ہے ان کے افسانوں سے ماخوذ کچھ فلسفیانہ اور گہرے طنز آمیز کلمات:

''آج تک تم لوگوں نے دھوکہ ہی کھایا ہے۔ دوسروں کے دست نگر بنے رہنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔'' (''کچھ تو نہیں بدلا'' ص ۲۰)

''آگ اور خون کی چادر اوڑھے جو لمحات گزرے تھے ان کے دامن پر

آنسوؤں کی کتنی بوندیں گری تھیں کون جانے۔'' (شگاف، ص ۲۸)

''تھوڑی سی روشنی کہیں سے نظر آتی ہے تو آدمی دوڑ پڑتا ہے مگر روشنی تو کیا ہاتھ آئے گی، آدمی اندھیرے میں مزید گم ہو کر رہ جاتا ہے۔''

(شہر چھوڑتا نہیں، ص ۳۴)

مذکورہ بالا جملوں میں دراصل ہندوستان کی اقلیتوں پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ بار بار دھوکہ کھاتے ہیں۔ آج آدمی بے روزگاری سے اس طرح متاثر ہو گیا ہے کہ گاؤں سے شہر، شہر سے دوسرے شہر، ملک سے بیرونِ ملک، ہجرت اور سفر کرنے میں کچھ نہیں دیکھتا مگر شہر کی چکاچوند اسے کیا دیتی ہے، یہ کسی کردار سے پوچھئے۔ دراصل افسانے کا تار و پود انہیں المیوں میں کہیں پوشیدہ ہے۔ احمد صغیر کے متن میں اس المیے کو ابھارنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔

میرے نزدیک اس مجموعے کی بہترین کہانی ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' ہے جس میں اس عہد کی مکمل تصویر بنانے کی سعی کی گئی ہے اور افسانہ نگار اس میں کامیاب ہے۔ ممکن ہو یہ افسانہ غیاث احمد گدی کے مشہور افسانہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا ہو جسے ہم افسانے میں تضمین کی صورت کہہ سکتے ہیں، مگر یہ تضمین اس قدر فنی ہے کہ یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ یہ افسانہ علامتی ہوتے ہوئے بھی پرندہ پکڑنے والی گاڑی سے بہتر افسانہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ غیاث احمد گدی کا افسانہ حد درجہ مبہم ہے اور کہانی پن سے کٹا ہوا ہے۔ یہ بھی کہ غیاث کے یہاں ''پرندہ'' لفظ کا استعمال اس طرح سے نہیں ہوا ہے جس طرح سے احمد صغیر کے کئی ایک افسانوں میں مختلف سیاق و سباق میں استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل احمد صغیر کے افسانوں کا کلیدی لفظ پرندہ ہے جو آج کے انسان کی کربناکیوں، خطرناکیوں، بے بسیوں اور ہر لمحہ ذبح ہو جانے کے خوف کا ترجمان بن جاتا ہے۔

''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' احمد صغیر کے افسانوی مجموعے پر تبصرہ کرنے والوں کی نگاہ میں ایک علامتی افسانہ ہے مگر میری نظر میں یہ محض علامتی افسانہ نہیں بلکہ یہ ایک اسطوری (Mythological) تصور یا معنی سے انحراف کرتے ہوئے ایک نئے معنوی سیاق سے جوڑتے ہوئے استعارہ سازی کا عمل ہے۔ اس افسانے کو اگر آپ نے پڑھا ہے تو محسوس کیا ہوگا کہ اس میں خموشیوں (Silences) اور خلاؤں (Gaps) کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہی نہیں، یہی رویہ ان کے بیشتر افسانوں میں دکھائی دیتا ہے یعنی بہت کچھ انہوں نے اپنے افسانے میں Unsaid رکھا ہے جس کی وجہ سے قاری اور مصنف دونوں کو مل کر معنی اخذ کرنے کا موقع ان کے متن میں ملتا ہے جو بہر صورت مابعد جدید متن یا رویوں کا خاصہ ہے۔ عین تابش کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ ''پرندہ ایک علامت کی شکل میں ان کی کہانی کے افق پر بار بار پھڑ پھڑاتا ہے...... وہ پرندہ جو انہیں اکثر خوف زدہ کرتا رہتا ہے، ان کے افسانوں کی ایک الگ بوطیقا تیار کرتا رہتا ہے۔''

اپنے افسانوی مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' میں انہوں نے تقریباً کئی ایک مقامات پر مختلف کہانیوں میں پرندہ لفظ کو نئے نئے معنوی سیاق میں خوبصورتی سے برتا ہے۔ مندرجہ ذیل جملوں میں اسے دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ کیا پرندہ واقعی ان کے افسانے کا کلیدی لفظ ہے؟

(۱) ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم اس گھر کو چھوڑ کر جائیں گے کہاں ——؟ منڈیر کی طرف دیکھتا ہوں جہاں بیٹھا پرندہ ابھی بھی مجھے گھور رہا تھا ——، ہُش.......... ہُش.......... ہُش..........۔''

میں اخبار اٹھالیتا ہوں..........!

دو سپر طاقتوں نے فضا سے اپنے خیمے اکھاڑ لینے کا معاہدہ کرلیا ہے۔ اب جنگ کے

خطرات کم ہو جائیں گے.........

میں اپنی ہتھیلی کو دیکھتا ہوں...... خون ...... یہ خون آیا کہاں سے......

تاملوں کا خون! پنجابیوں کا خون! امن دستے کا خون، اقلیت کا خون۔

تم نے بندر کو انسان کا نام دے کر ایک جرم کیا ہے کہ ہمارا نام بندر ہوتا!

(منڈیر پر بیٹھا پرندہ)

(۲) ''خشک شاخوں پر بیٹھے پرندوں کا غول بوکھلا کر ایک دوسرے سے ٹکرا گیا تھا۔ آپس میں الجھ کر پرندے بدحواس ہو اٹھے تھے۔'' (سرنگ ص ۱۴)

(۳) ''اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی، کتنا سرخ تھا جیسے کئی پرندوں کو ایک ساتھ قتل کر دیا گیا ہو۔'' (''بے پناہ جنگل اور وجود'' ص ۱۵)

(۴) ''آبی پرندے فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔'' (عجوبہ ص ۵۸)

لیکن ہم لوگ ٹھوس قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ ہم زمین سے چپکے ہوئے جانور ہیں اور وہ اڑنے والے پرندے۔'' (عجوبہ ص ۵۹)

(۵) آسمان پر گدھوں کا رقص شروع ہو چکا ہے۔''

(۶) وہ کچھ بولنا چاہتا ہے مگر بول نہ سکا۔ وہ کبھی مجھے دیکھتا، کبھی پنجرے میں بند پرندوں کو —— میں نے بڑھ کر سبھی دروازے کھول دیے۔ پھُر...... پھُر...... پھُر...... سبھی پرندے اڑ گئے۔

(۷) ''وقت کو اس سے کیا غرض کہ ہم پنجرہ میں بند ہیں یا آزاد ہیں؟''

(''اپنا اپنا پنجرہ'' ص ۷۹)

مثالیں اور ہیں فی الحال مذکورہ بالا جملوں میں نثر کی منطقیت اور فطرت کے ضمن میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ نثر مبہم نہیں ہے۔ شعری سحر کاری سے دور ہے، نحوی معنیات میں اگر کوئی انقلاب نہیں نظر آتا تو کم از کم اسے نثر ضرور رہنے دیا گیا

ہے جس میں جذباتی وفور کی جگہ ذہنی ورزش نظر آتی ہے۔ مثال نمبر ایک میں ہجرت کو رَد کیا گیا ہے۔ دیکھیں جو پرندہ راوی کو گھور رہا ہے وہ اس عہد کی لامکانی صورت حال، بے روزگاری سے پیدا شدہ دہشت گردی کا پرندہ ہے جسے ''ہُش...... ہُش...... ہُش'' جو پرندوں کو اڑانے کے لئے Onomotopoeia، صوت نقلی ہے، کا اثر اس پرندے پر نہیں ہوتا۔ پھر اچانک اخبار اٹھانا میڈیا بہ نام مافیا، پھر اس جملے کے بعد سپر طاقتوں کے ذکر سے ''پرندہ'' لڑاکو طیارے کا استعارہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح آبی پرندوں کا فضا میں پرواز کرنا دراصل مرکزی رول ادا کرنے والی اشیاء کے خلاف حاشیے کی چیزوں کا مرکز میں آنے کی طرف اشارہ ہے جو مابعد جدید حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ یہ پرندہ گدھ بھی ہے جو مردار کھاتا ہے۔ پرندہ پنجرے میں پھڑ پھڑا بھی رہا ہے، یہ بیک وقت معصوم ملک کے شہری بھی ہیں۔ اچھی نثر میں اس طرح کی استعاراتی نوعیتیں ہوتی ہیں جو دور از کار نہیں بلکہ تشریحیہ ہوتی ہیں۔

''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' کیا ہے؟ اگر پرندہ ہے تو کون سا پرندہ ہے ''کوا'' ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ آدمی میں نوا (نائی) اور پنچھی میں کوا دونوں چور کی حد تک چالاک ہوتے ہیں۔ مور ہے یا الو ہے۔ اگر الو ہے تو اس کی منحوسیت کا جواب نہیں، مور ہے تو جمالیاتی پہلو سامنے آئے گا مگر منڈیر پر اس کے ہمیشہ بیٹھے رہنے سے ایک فیملی میں Terror کا منظر پیدا ہوگیا ہے۔ یہیں پر افسانے میں پرندہ پرندہ نہ رہ کر وحدانی معنی سے کٹ کر معنی التوا سے جڑ جاتا ہے۔ یعنی معنی پس معنی کا سیاق سامنے آتا ہے۔ اس طرح کہانی کا ہر ساختیہ کہانی میں Twist کا سبب بنتا ہے اور معنی کے ابعاد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا منڈیر پر بیٹھا پرندہ تشدد، تماشہ سوسائٹی یا میڈیا سے پیدا شدہ مسائل ہیں یا علیحدگی پسند تحریکوں کی جارحیت ہے یا دہشت گردی اور

فرقہ وارانہ آئیڈیلوجی سے پیدا شدہ خوف۔ ان میں سے آپ پرندے کو کسی بھی تصور سے جوڑ سکتے ہیں۔ یہ وہ پرندہ نہیں ہے جو آنگن میں جب بیٹھتا تھا تو برہن اپنے پردیسی کا حال دریافت کرتی تھی اور اپنے دل کا حال اس سے سناتی تھی۔ پرندہ کی یہی مروجہ، روایتی اور اسطوری صورت تھی جس کو زمانے نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور یہ افسانہ اسی اسطور سے چھن جانے کا المیہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

ان کے تمام افسانوں کی قرأت کے بعد یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ جسے ہم مختصر افسانہ کہتے ہیں، اس کی پاسداری احمد صغیر کے افسانوں میں چند ایک نقائص کے ساتھ کی گئی ہے۔ نقائص کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔ ان کا متن اردو ادب کی چار بڑی تحریکوں رومانیت/ ترقی پسندی/ جدیدیت/ مابعد جدیدیت کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ جدیدیت نے کرداروں کے چہرے پر ابہام کی کالک پوت دی تھی۔ ۸۰ء کی دہائی میں کرداروں کی تعمیر اور ان کے چہروں کو منور کرنے کا کام جن لوگوں نے کیا ان میں ایک اہم نام احمد صغیر کا بھی ہے، جن کے حسب ذیل کردار یاد رہ جائیں گے۔ مثلاً ''شگاف'' کی صنوبر، ''بے پناہ جنگل اور وجود'' کا علی عباس، ''شہر چھوڑتا نہیں'' کی فرحت، ''سرنگ'' کی کنیز، ''اداس ہوجانے والا لمحہ'' کی سکینہ وغیرہ۔ احمد صغیر کے ان کرداروں کو زندہ اور متحرک کردار حسین الحق صاحب بھی مانتے ہیں۔

احمد صغیر اور بہت حد تک ان کے ہم عصروں کے یہاں تشبیہی کہانویت ہے جس میں کہیں کہیں استعاراتی کہانویت برائے ضرورت دکھائی پڑتی ہے۔ مثلاً کچھ جملے دیکھیں:

(۱) ''ساری دنیا درد کی گٹھری بن گئی تھی'' — (بے پناہ جنگل اور وجود)

(۲) ''ذرا دیر بعد اس کا سرخ چہرہ پھیکا پڑنے لگا جیسے دھوپ لگنے سے کچا رنگا ہوا کپڑا اپنا رنگ بدل دیتا ہے۔'' (سرنگ)

(۳) ''اس کے حلق سے ایک ذبح ہوتے ہوئے آدمی کی آواز سے بھی زیادہ بھیانک چیخ نکلتی ہوئی دور فضا میں پھیلتی چلی جاتی ہے۔'' (کچھ بھی تو نہیں بدلا)

(۴) ''اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی، کتنا سرخ تھا جیسے کئی پرندوں کو ایک ساتھ قتل کردیا گیا ہو۔'' (بے پناہ جنگل اور وجود)

یہ تشبیہیں نہ جانے کتنی کہانیاں ہم سے کہتی ہیں۔ آج کے افسانوں میں خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو والی بات نہیں بلکہ ان میں ایک فنکارانہ اور زیریں شور کی صورت میں مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ احمد صغیر کے یہاں اس قسم کی مقصدیت دیکھی جاسکتی ہے۔

یہ عہد میڈیا کا ہے، اس لئے صحافتی زبان کا جبر آج کے ہر افسانہ نگار پر محسوس کیا جاسکتا ہے، اس سے احمد صغیر بھی مبرا نہیں ہیں۔ میں اس جبر کو اس عہد کے افسانوں کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ صحافتی نثر کا جبر افسانے میں تفتیشی نثر (Discursive prose) کو جنم دیتا ہے جس سے افسانے کے ماحول میں تجسس اور سنسنی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ عین تابش کا یہ کہنا کہ احمد صغیر تسلسل کے ساتھ سوچ رہے ہیں اور اسی لئے موضوع پر ان کی گرفت اچھی ہے لیکن افسانوی اسلوب سے یا تو وہ شعوری انحراف کے قائل ہیں یا پھر مخصوص موضوعات کے انتخاب نے اسلوبی نہج کو دبانے کی کوشش کی ہے، درست ہے۔ اس ضمن میں ایک بات بہت ضروری ہے جس پر شاید ان کی نگاہ نہیں ہے۔ افسانہ بہرصورت نثری صنف ہے اور نثر میں سیدھے سیدھے جذبات نہیں پیش کئے جاتے، جس کی جھلکیاں بیشتر افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جدیدیت کے دور کے افسانوں میں جذبات محض کے وفور نے نثر کو نظم بنادیا تھا۔ جذبات محض کی ترجمانی کے لئے شاعری مخصوص ہے، نثر میں زیادہ سے زیادہ جذبات کا تجزیہ ہوتا ہے جو بہرصورت جذباتی نہیں بلکہ ایک ذہنی عمل ہے۔ لہٰذا

جذبات نثر میں عملی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اہم افسانہ نگاروں کے یہاں مثلاً مشرف عالم ذوقی، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، پیغام آفاقی کے علاوہ احمد صغیر کی افسانوی نثر شعری اسلوب سے گریز کرتی ہے کیونکہ یہ لوگ نثر کو اس کی فطرت کے دائرے میں رکھنے اور برتنے کے قائل نظر آتے ہیں۔

احمد صغیر کی نثر میں فلم کی تکنیک یعنی اسکرپٹ کی تکنیک بھی ایک غالب عنصر ہے۔ ان کے جملے میں شارٹ کے بعد کٹ کا انداز اور پھر فلم یعنی افسانے کے تمام کٹ کو جوڑ دینے کا ہنر بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو افسانے ''کرفیو کب ٹوٹے گا'' اور ''سفر ابھی ختم نہیں ہوا'' کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ان کا افسانہ ''مسیحا کون ہے ربا'' مکالماتی انداز یا صرف مکالمہ پر منحصر افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مکالماتی آہنگ میں صدیوں پرانے تصور یا مہابیانیہ کو رَد کر کے انسان کو اس کے سیاق وسباق میں دیکھنے کی وکالت کی گئی ہے۔

''عجوبہ'' نامی افسانے میں عجائبات دنیا پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی تبدیلی یا نئے پن کی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا ہے جو کچھ دنوں بعد ایک عام واقعہ یا شئے میں تبدیل ہو جاتا ہے، کیونکہ بقول مصنف ستیا کا زمین سے پیدا ہونا ایک خاص زمان میں عجوبہ تھا، اب یہ کہانی بن گیا ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ احمد صغیر کا متن نثر کی بہت بڑی خوبی طنزیہ اسلوب سے تیار ہوا ہے جس کی مثال ان کے ایک افسانے ''محض انتظار'' میں موجود ہے۔ شاید یہی ان کے افسانے کی تخلیق کے محرک بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ''محض انتظار'' میں کچھ اس طرح کے جملے ملتے ہیں:

گاندھی کے تین بندروں کی طرح

ہم روز بہت کچھ دیکھتے ہیں —— مگر آنکھیں بند کر لیتے ہیں

ہم روز بہت کچھ سنتے ہیں —— مگر کان بند کر لیتے ہیں

ہم بھی اپنے منھ میں زبان رکھتے ہیں —— مگر منھ پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں

فکشن جو فنی اکتساب کے بغیر ممکن نہیں، مندرجہ بالا جملوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ احمد صغیر نے اپنے افسانوں میں ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور اس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں چیزوں کی تصویر مکمل بنتے بنتے رہ گئی ہے۔ یہی نہیں جو چیز ان کے یہاں واضح طور پر کھٹک سکتی ہے وہ موضوعات کی تکرار ہے۔ مثلاً جہیز، فرقہ وارانہ فسادات، استحصال، عدم تحفظ، دہشت وغیرہ۔ بعض جگہوں پر انہوں نے لیک سے ہٹ کر بھی موضوع کی طرف ردّعمل کا اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں ان کے یہاں Understatement بھی ضرورت سے زیادہ ہے جس سے افسانے میں کہانی پن کو دھکا لگا ہے۔

اخیر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد صغیر کا متن ماقبل تحریکوں سے الگ آج کی مابعد جدید صورت حال کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ ان کا متن سیاست کی غلاظت اور سڑاند سے متاثر ردّعمل نے تیار کیا ہے جس کے عین قلب میں اقلیتوں اور پس ماندہ طبقوں پر ہو رہے مظالم کا دکھ پوشیدہ ہے جو فن کار کے متن کو جدید معاشرے کے اس نوع کے قارئین سے جوڑتا ہے اور اس طرح احمد صغیر کا متن آج کے پگھلتے، گلتے، بدلتے اور ہر لمحہ مرتے ہوئے انسان کا رزمیہ بن جاتا ہے۔

●●

احمد صغیر، نئے افسانے کا ایک اہم اسم بن چکے ہیں۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نئی برق تجلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عذاب روشنائی سے لکھی، ان کی کہانیوں کے سینے میں جو آگ ہے، وہ کاغذ پہ پھیلتی نظر آتی ہے۔ احمد صغیر، آج کے افسانہ نگار ہیں، اس لیے ان کے مسائل اور وقوعے بھی آج کے ہیں۔ ان کے تخلیقی اضطراب اور تحرک کو ان کے افسانوں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے، اس آرٹ سے احمد صغیر آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نہ ابہام ہے، نہ اہمال اور نہ اغلاق اور نہ ان کی کہانیاں ترسیل کی ناکامی کی نذر ہوتی ہیں۔ زمین اور ارضی مسائل و متعلقات سے ان کا گہرا ارتباط، ان کی کہانیوں کو فنی اور فکری جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ احمد صغیر کے سینے میں 'دہشت' کی نہیں 'درد' کی جوالا بھڑک رہی ہے اور یہی جوالا ان کے نظامِ فکر وفن اور اظہاری جمالیات کو روشن رکھتی ہے۔ ان کے افسانے، ایک خاص تناظر اور سیاسی سیاق وسباق میں لکھے گئے ہیں۔ بہار کے مخصوص سیاسی پچویشن سے شناسائی کے بغیر ان کے فکشن کی تفہیم، تفسیر وتقطیر ممکن نہیں۔ 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ' سے لے کر 'انا کو آنے دو' تک ان کا تخلیقی سفر بہت ہی خوبصورتی سے طے ہوا ہے۔ امید ہے کہ وہ فکشن کے صحرائے عبیط میں اپنے تخلیقی جنون کی لمبی مسافت طے کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ احمد صغیر، نئی کہانی کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔ خدا کرے ان کا تخلیقی الاؤ روشن رہے۔ مگر کیا ہی اچھا ہو کہ اس الاؤ کے اردگرد کرشن کی بانسری بھی بجتی رہے اور اس میں تھوڑا سا 'مدھوبن' بھی مدغم ہو جائے۔ احمد صغیر نے فکشن کا باکرہ منطقۂ حارہ دریافت کیا ہے۔ ان کا یہ افسانوی مجموعہ 'انا کو آنے دو' ماڈرن فکشن کے نئے امکانات اور بشارتیں سمیٹے ہوئے ہے۔

حقانی القاسمی